جلد ۱۴۴ ماہ صفر المظفر ۱۴۱۰ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۸۹ء عدد ۳

مضامین

شذرات — ضیاء الدین اصلاحی — ۱۶۲-۱۶۴

مقالات

قرآن مجید کا تصور ربوبیت الٰہی اور مولانا ابوالکلام آزاد — ضیاء الدین اصلاحی — ۱۶۵-۱۹۱

تحفۃ المجاہدین کا ایک مطالعہ — ڈاکٹر سید احتشام ندوی صدر شعبۂ عربی کالی کٹ یونیورسٹی۔ کیرالا — ۱۹۲-۲۰۶

حسرت کی سیاسی شاعری — جناب نسرین ممتاز بصیر صاحبہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی — ۲۰۷-۲۱۶

دیوان بیدار میں شامل ایک غزل — ڈاکٹر نسیم احمد کچھا نارس ہندو یونیورسٹی — ۲۱۷-۲۲۳

اخبار علمیہ — ع۔ص — ۲۲۴-۲۲۶

وفیات

چند عرب فضلاء کی موت — حافظ عمیر الصدیق دریابادی ندوی رفیق دارالمصنفین — ۲۲۷-۲۳۳

ادبیات

ملت بیضا — جناب مقصود احمد مقصود لکچرار ایم۔ ایس یونیورسٹی بڑودہ۔ — ۲۳۴-۲۳۵

غزل — جناب بسنت کمار بسنت ایڈووکیٹ لکھنؤ — ۲۳۵

مطبوعات جدیدہ — "ض" — ۲۳۶-۲۴۰

شذرات

ملک میں عام انتخابات کا زمانہ قریب آگیا ہے، انتخابی مہم اور سرگرمی بھی شروع ہوگئی ہے، جس میں ملک و قوم کے بنیادی اور اصلی مسائل سے زیادہ ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشی کی جارہی ہے، ہر پارٹی اپنے کو پاک صاف اور اپنے مخالف کو ملک کا غدار اور دشمن کہہ رہی ہے، سیاسی جماعتوں کے سربراہ اور رہنما جس زبان او لب ولہجہ میں باتیں کر رہے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب سیاست میں اصول، کردار، شرافت، شائستگی، معقولیت، ایمانداری، حق پسندی اور خلوص و ایثار نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی ہے، ہر سیاسی پارٹی میں اکثریت ایسے خودغرض لوگوں کی ہوگئی ہے جن کو نہ قوم کے مفاد و منفعت سے کوئی سروکار ہے اور نہ ملک کی عزت و نیک نامی ہی سے غرض ہے، سب کا مقصد بس اقتدار حاصل کرنا ہے چاہے یہ جس طرح بھی ممکن ہو۔

ملک کے سیاسی حالات اس قدر تشویش انگیز ہوگئے ہیں کہ بے داغ سیرت و کردار کے حامل، قوم کے درد مند اور ملک کے بے لوث خادم موجودہ فضا میں گھٹن محسوس کرنے لگے ہیں، اور وہ سیاست سے کنارہ کش اور بے تعلق ہوتے جارہے ہیں، ان کے راستے سے ہٹ جانے کے بعد سماج دشمن اور جرائم پیشہ لوگوں نے اس میدان پر قبضہ کرلیا ہے، اور ہر سیاسی پارٹی نے ان کے لیے اپنے دروازے کھول دیے ہیں، اس سے آئندہ انتخاب کی خطرناک صورت حال کا اندازہ ہونے لگا ہے، حال ہی میں لکھنؤ اور الٰہ آباد میں کارپوریشن کے اور اس سے پہلے پورے اترپردیش میں جو میونسپل انتخابات ہوئے ہیں ان میں بڑی تعداد میں ناپسندیدہ عناصر منتخب ہوئے ہیں، بلکہ بعض تو جیلوں میں رہنے کے باوجود کامیاب ہوگئے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ انتخاب میں ہر قسم کے غلط طریقے اختیار کیے جائیں گے، دھاندلی، بدعنوانی، زور زبردستی اور جبر و تشدد کا مظاہرہ ہوگا، ووٹروں کو ڈرا دھمکا کر پولنگ بوتھوں پر قبضہ کیا جائے گا، جعلی اور فرضی ووٹ ڈالے جائیں گے اور طاقت و دولت کے سہارے اور جرائم پیشہ لوگوں کی مدد سے الکشن میں کامیابی حاصل کی جائیگی

موجودہ سیاسی صورت حال سے ملک کے سیاسی و سماجی نظام کے درہم برہم ہوجانے اور سیکولرازم اور جمہوریت پر سے اعتماد متزلزل ہوجانے کا جو خطرہ پیدا ہوگیا ہے اس کی بنا پر صدر جمہوریہ ہند مسٹر آر وینکٹ رمن

نے یوم آزادی کے موقع پر سیاسی پارٹیوں سے اپیل کی ہے کہ وہ انتخابات میں سیاسی وقار کو باقی رکھیں فرقہ وارانہ کشیدگی اور تشدد سے باز رہیں، دوسروں کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھیں، انھوں نے انتخابات یں دولت اور جسمانی قوت کے استعمال، پولنگ بوتھوں پر قبضہ کرنے اور ووٹروں کو ڈرانے دھمکانے جیسے طریقوں کو اپنانے سے منع کیا ہے، کانگریس اور بعض دوسری سیاسی جماعتوں کے چند اہم لیڈروں نے بھی ایک مشترکہ بیان جاری کرکے ان چیزوں کی مذمت کی ہے، وزیر اعظم نے یوم آزادی کی تقریر یں یہ اعلان کیا ہے کہ "حکومت جرائم پیشہ اور سماج دشمن عناصر کو سیاست سے دور رکھنے کے اقدام رہی ہے"۔ مگر جب سر سے پانی اونچا ہوگیا ہے اور زہر پورے جسم میں سرایت کرچکا ہے تو کیا اس طرح کے اظہار خیال سے بگڑی ہوئی فضا درست ہوسکتی ہے، اور ناپسندیدہ عناصر آسانی سے اپنی شکست تسلیم یں گے، جبکہ ان کو سیاسی جماعتوں کی سرپرستی اور پشت پناہی حاصل ہے، اور خود وزیر اعظم کی پارٹی بھی بے داغ نہیں ہے۔

ملک کے حالات کو اس درجہ تک پہونچانے کی ذمہ داری حکمراں اور مخالف جماعتوں پر یکساں طور سے د ہوتی ہے، یہ صورت حال دفعتہً نہیں پیدا ہوگئی ہے بلکہ اس کی جڑیں قومی، سیاسی اور سماجی زندگی ں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں، اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ملک نے بعض حیثیتوں سے نمایاں قی کی ہے، مگر افسوس یہ ہے کہ اس کی اخلاقی اور ذہنی سطح کو بلند کرنے پر کوئی توجہ نہیں دی گئی جس کی ے حکومت کے تمام شعبوں اور دفتروں میں بددیانتی اور بدعنوانی پھیلی ہوئی ہے، عدالتوں میں صاف بک رہا ہے، لوٹ کھسوٹ اور رشوت کا بازار گرم ہے، قتل و غارت گری عام ہے، کسی کی ال اور عزت و آبرو محفوظ نہیں، انتشار اور لاقانونیت بڑھتی جارہی ہے، ایسے نازک وقت میں بھی ک و قوم کی رہنمائی کے لیے وہ لوگ آگے نہیں بڑھتے جو جمہوریت سیکولرازم اور فرقہ وارانہ میل جول ے کی ترقی کا ذریعہ خیال کرتے ہیں اور اخلاق و سیرت کی پاکیزگی اور روحانیت کو اس ملک کا اصل تیار سمجھتے ہیں تو نہیں کہا جاسکتا کہ آئندہ اس کا انجام کیا ہوگا، ملک سنجیدہ، شریف اور نیک طینت

لوگوں سے خالی نہیں ہوا ہے، یہی لوگ سیاسی فضا کو زہر آلود ہونے اور ملک کا بیڑا غرق ہونے سے
بچا سکتے ہیں، ملک کی حقیقی خدمت اور اصلی حب الوطنی یہی ہے کہ ان سے پورا تعاون کیا جا…
اور انھیں ملک و قوم کی خدمت کا موقع دیا جائے۔

اردو کو پورے صوبۂ بہار کی دوسری سرکاری زبان بنانے پر بہار کے وزیر اعلیٰ مسٹر ستیندر نرائن…
مبارکباد کے مستحق ہیں، اس کا آغاز سابق وزیر اعلیٰ مسٹر جگن ناتھ مشر نے کیا تھا جو اس وقت بہار پر…
کانگریس کے صدر ہیں، اس لیے وہ بھی قابل ستائش ہیں، اس فیصلے سے پورے ملک میں پھیلی…
اردو آبادی میں خوشی و مسرت کی لہر دوڑ گئی ہے، یہ دراصل کانگریس کی اصل سیکولر اور جمہوری پالیسی…
لسانی اقلیتوں کے معاملہ میں اس کی قدیم روایتی فراخ دلی اور بے تعصبی کا ازسرنو اعادہ ہے، اس سے…
کانگریس کی ساکھ مضبوط ہوگی اور عوام میں بھی اس کا اعتماد بحال ہوگا، وزیر اعلیٰ بہار نے اردو…
جمہوری و دستوری حق دے کر پورے ملک میں اولیت کی جو مثال قائم کی ہے اس سے ان…
اور جمہوریت کا نام روشن ہوا ہے، دوسری ریاستوں کو بھی اس کی تقلید کرنی چاہیے۔

یہ سطریں لکھی جا چکی تھیں کہ اطلاع ملی کہ اتر پردیش حکومت نے بھی اردو کو دوسری سر…
زبان بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے، اور ستمبر کے آخر میں اسمبلی کے اجلاس میں اس کا بل پیش کر د…
یہ فیصلہ گو بہت تاخیر سے ہوا، تاہم اس سے اردو حلقہ میں دھوم مچ گئی ہے، اور اصل…
تحریک اب نیا موڑ لے چکی تھی، اور اسے فرقہ واریت سے محفوظ رکھنے کے لیے ہندی…
بھی اردو کی حمایت کرنے لگے تھے، ابھی حال ہی میں اتر پردیش کے گورنر نے بھی حکومت…
اس کی ہدایت کی تھی، اس لیے اب اس کے لیے اس معاملہ کو مزید التوا میں ڈالے رکھنا…
نہیں تھا، ہم اپنے سیکولر اور انصاف پسند وزیر اعلیٰ نرائن دت تیواری کے اس فیصلے کا خیر مقدم کر…
اور ان کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

مقالات

قرآن مجید کا تصورِ ربوبیت الٰہی اور مولانا ابوالکلام آزاد[1]

از: ضیاء الدین اصلاحی

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا سب سے مہتم بالشان علمی و تصنیفی کارنامہ "ترجمان القرآن" ہے
اس میں خصوصیت سے سورۂ فاتحہ کی تفسیر مولانا کا شاہکار ہے۔ دوسری سورتوں کے تفسیری حواشی
اشارات اور مختصر نوٹ کی صورت میں ہیں جن میں مطالب کا زیادہ پھیلاؤ نہیں ہے مگر اس سورہ کی تفسیر
مولانا نے تفصیل سے لکھی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سورہ فاتحہ قرآن مجید کی اولین سورہ اور اس کا دیباچہ
و مقدمہ ہے، اس میں اور قرآن مجید کے دوسرے حصوں میں اجمال و تفصیل کا سا تعلق ہے، تمام
سورتوں میں دین حق کے جو مقاصد بہ تفصیل بیان کئے گئے ہیں، سورۂ فاتحہ میں انہیں کا بہ شکل اجمال بیان
ہے گویا یہ قرآن مجید کا خلاصہ اور نچوڑ ہے، اس لئے مصنف نے ضروری اور مناسب خیال کیا کہ قرآن
مجید کے مقدمہ و دیباچہ کو اچھی طرح قارئین کے ذہن نشین کرا دیں تاکہ اگر وہ پورا قرآن نہ بھی پڑھ سکیں تو
اس کے دیباچہ کو پڑھ کر اس کی اصلی روح اور بنیادی تعلیم سے بخوبی واقف ہو جائیں۔ سورہ فاتحہ کی یہ تفسیر
گوناگوں اہم اور مفید مطالب و معارف پر مشتمل ہے۔ کسی ایک مضمون میں نہ تو ان تمام خصوصیات
و خوبیوں کی نشاندہی ممکن ہے اور نہ ان حقائق و دقائق اور اسرار و نکات کا احاطہ ہی کیا جا سکتا ہے
جو مولانا کے گہربار قلم نے اس سورہ کی تفسیر میں جا بجا قلمبند کئے ہیں۔

سورۂ فاتحہ کی ابتدا خدا کی حمد سے کی گئی ہے اس کے بعد اس میں بالترتیب اس کی یہ تین صفتیں

---

[1] یہ مقالہ اتر پردیش اردو اکادمی کے سیمینار منعقدہ ۲۲ تا ۲۴ جون ۱۹۸۹ء کو پڑھا گیا۔

بیان کی گئی ہیں ربوبیت، رحمت اور عدالت۔ خداوند قدوس کی ان تینوں صفات کی حقیقت و ماہیت اور ان کے وسیع و ہمہ گیر پہلوؤں کو مولانا نے پوری خوبی و خوبصورتی کے ساتھ واضح کیا ہے، ذیل میں صرف ربوبیت الٰہی کے سلسلہ میں مولانا کی تحقیق و تدقیق اور سعی و جستجو کا ماحصل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

خدا نے اس سورہ میں اپنی ربوبیت کا ذکر رب العالمین کہہ کر کیا ہے، مولانا کے نزدیک یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا کی ربوبیت عالمگیر ہے جو ہر فرد، ہر قوم، ہر جماعت، ہر ملک اور ہر گوشۂ وجود کے لئے ہے اور یہ تنگ نظری پر مبنی ان تمام نظریات کے خاتمہ کا اعلان ہے جو دنیا کی مختلف قوموں اور نسلوں میں پیدا ہو گئے تھے اور جن کی وجہ سے ہر قوم یہ سمجھنے لگی تھی کہ خدا کی برکتیں اور سعادتیں اسی کے لئے مخصوص ہیں، کسی دوسری قوم کا ان میں حصہ نہیں ہے۔

مولانا سب سے پہلے رب کے لفظ کی حقیقت کو واضح کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ یہ سامی زبانوں کا ایک کثیر الاستعمال مادہ ہے اور عربی، عبرانی اور سریانی تینوں میں اس کے معنی پالنے کے ہیں جو بہت وسیع مفہوم و معنی میں آیا ہے ان کے نزدیک ربوبیت کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کو یکے بعد دیگرے اس کی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق اس طرح نشوونما دیتے رہنا کہ وہ اپنی حد کمال تک پہنچ جائے۔ ان کے نزدیک بھوکے کو کھانا کھلانا، محتاج کو روپے دے دینا جود و کرم اور احسان ہے لیکن ربوبیت نہیں ہے، ربوبیت کے لئے وہ پرورش و نگہداشت کے ایک مسلسل اور جاری رہنے والے اہتمام کو ضروری قرار دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ کسی وجود کی تکمیل و بلوغ کے لئے وقتاً فوقتاً جو ضرورتیں پیش آتی رہیں، ان سب کا محبت و شفقت کے ساتھ سر و سامان کرنا ربوبیت ہے۔

اس مفہوم کو واضح کرنے کے لئے مولانا نے ماں کی مامتا کی مثال دی ہے گو یہ بھی ان کے خیال میں ناقص اور محدود مثال ہے تاہم وہ فرماتے ہیں کہ ماں کی فطرت میں جوش محبت ودیعت کر دیا گیا ہے،

پیدائش کے وقت بچہ محض گوشت پوست کا ایک لوتھڑا ہوتا ہے اور اس کی زندگی اور نمو کی قوتیں پرورش و تربیت کی محتاج ہوتی ہیں اس لئے محبت و شفقت، حفاظت و نگہداشت اور بخشش و اعانت کا ایک طول طویل سلسلہ درکار ہوتا ہے جس کو بچہ کے جسم و ذہن کے حد بلوغ کو پہنچنے تک جاری رہنا چاہئے، وہ فرماتے ہیں کہ چونکہ پرورش کی ضرورتیں بے شمار ہیں اور ان کی نوعیت بھی ہمیشہ بدلتی رہتی ہے اس لیے ہر عمر اور ہر حالت کے مطابق محبت کا جوش، نگرانی کی نگاہ اور زندگی کا سر و سامان ہونا ضروری ہے، ان کے نزدیک خدا کی حکمت نے ماں کی محبت میں یہ سارے خط و خال جمع کر دیئے ہیں اور وہ پیدائش کے روز سے بلوغ تک بچہ کو پالتی، بچاتی، سنبھالتی اور ہر وقت اور ہر حالت کے مطابق پرورش کا سامان مہیا کرتی رہتی ہے۔

پھر مولانا بچہ کی پرورش کے اس نظام کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ ابتدا میں بچہ کو دودھ ہی پلایا جاتا ہے کیوں کہ اس وقت اس کا معدہ دودھ کے سوا کسی غذا کا متحمل نہیں ہوتا مگر جب اس سے زیادہ قوی غذا کی ضرورت ہوئی تو وہ اسے دی جانے لگی۔ جب تک اسے کھڑے ہونے کی سکت نہ تھی ماں گود میں لئے پھرتی تھی اور جب کھڑے ہونے کے لائق ہوا تو ماں انگلی پکڑا کر اسے چلانے لگی، اس سے ظاہر ہوا کہ مولانا کے نزدیک ربوبیت کا مفہوم یہ ہے کہ بچہ کی ہر حالت اور ضرورت کے مطابق اس کی ضروریات مہیا ہوتی رہیں اور نگرانی و حفاظت کا ایک مسلسل اہتمام جاری رہے۔

اس ناقص و محدود مثال کو بیان کرنے کے بعد مولانا ربوبیت الٰہی کو غیر محدود حقیقت کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جس طرح خدا کی خالقیت نے کائنات اور اس کی تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے اسی طرح اس کی ربوبیت نے ہر مخلوق کی پرورش کا سر و سامان بھی کر دیا ہے چنانچہ اس کی زندگی اور بقا کے لیے جو کچھ چاہئے وہ اسے عجیب و غریب نظام کے ساتھ اس کے حالات و ضروریات کی رعایت کے ساتھ مل رہا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں۔

"چیونٹی اپنے بل میں رینگ رہی ہے، کیڑے مکوڑے کوڑے کرکٹ میں ملے ہوئے ہیں، مچھلیاں دریا میں تیر رہی ہیں، پرند ہوا میں اڑ رہے ہیں، پھول باغ میں کھل رہے ہیں، ہاتھی جنگل میں دوڑ رہا ہے اور ستارے فضا میں گردش کر رہے ہیں لیکن فطرت کے پاس سب کے لئے یکساں طور پر پرورش کی گود اور نگرانی کی آنکھ ہے اور کوئی نہیں جو فیضانِ ربوبیت سے محروم ہو، اگر مثالوں کی جستجو میں تھوڑی سی کاوش جائز رکھی جائے تو مخلوقات کی بے شمار قسمیں ایسی ملیں گی جو اتنی حقیر اور بے مقدار ہیں کہ غیر مسلح[1] آنکھ سے ہم انہیں دیکھ بھی نہیں سکتے، تاہم ربوبیت الٰہی نے جس طرح اور جس نظام کے ساتھ ہاتھی جیسی جسیم اور انسان جیسی عقیل مخلوق کے لئے سامانِ پرورش مہیا کر دیا ہے۔ ٹھیک ٹھیک اسی طرح اور ویسے ہی نظام کے ساتھ ان کے لئے بھی زندگی اور بقا کی ہر چیز مہیا کی ہے اور پھر یہ جو کچھ ہے انسان کے وجود سے باہر ہے اگر انسان اپنے وجود کو دیکھے تو خود اس کی زندگی اور زندگی کا ہر لمحہ ربوبیت الٰہی کی کرشمہ سازیوں کی ایک پوری کائنات ہے۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ○	اور ان لوگوں کے لئے جو (سچائی پر) یقین رکھنے والے ہیں زمین میں (خدا کی کارفرمائیوں کی) کتنی ہی نشانیاں ہیں اور خود تمہارے وجود میں بھی،
(ذاریات ۲۰ و ۲۱)	پھر کیا تم دیکھتے نہیں؟"[2]

نظامِ ربوبیت | یہ پہلے واضح ہو چکا ہے کہ مولانا کے نزدیک ربوبیت کے عمل اور سامانِ زندگی

[1] Naked Eye غیر مسلح آنکھ یعنی ایسی آنکھ جو اپنی قدرتی نگاہ سے دیکھ رہی ہو، زیادہ قوت کے ساتھ دیکھنے کا کوئی آلہ مثلاً خوردبین اس کے ساتھ نہ ہو۔
[2] ترجمان القرآن ج ا ص ۳۶ و ۳۷ زمزم کمپنی لمیٹڈ لاہور طبع دوم ۱۹۴۷ء۔

کی بخشایش میں فرق ہے کیونکہ دنیا میں زندگی اور نشوونما کے لئے سودمند اشیاء و عناصر کی موجودگی کے ساتھ ان کی تقسیم کا ایک نظام بھی موجود ہے یعنی فطرت جو کچھ عطا کرتی اور بخشتی ہے وہ ایک مقررہ انتظام، منضبط ترتیب و مناسبت کے ساتھ بخشتی ہے، چنانچہ ہر ایک کی زندگی و بقا کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ اسے متعین وقت اور مقررہ مقدار میں مل رہی ہے، اس نظم و انضباط کے ساتھ تمام کارخانہ حیات چل رہا ہے، مثلاً زندگی کے لئے پانی کی ضرورت ہے جو نہ صرف یہ کہ موجود ہے بلکہ ایک خاص انتظام، خاص ترتیب اور خاص مقررہ مقدار کے ساتھ موجود ہے، وہ فرماتے ہیں کہ فطرت صرف پانی بناتی ہی نہیں ہے بلکہ اسے ایک خاص ترتیب و مناسبت کے ساتھ بناتی اور ایک خاص اندازہ کے ساتھ بانٹتی رہتی ہے، یہی ربوبیت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر پانی جیسا جوہر حیات پیدا کرنا اللہ کی رحمت ہے تو اسے ایک ایک بوند ٹپکانا، زمین کے ایک ایک گوشے تک پہنچانا، ایک خاص مقدار اور حالت میں تقسیم کرنا، ایک خاص موسم اور محل میں برسانا اور پھر زمین کے ایک ایک تشنہ ذرے کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر سیراب کرنا خدا کی ربوبیت ہے۔

وہ بعض قرآنی آیات پیش کر کے ثابت کرتے ہیں کہ قرآن نے اشیاء کے قدر اور مقدار کا ذکر اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے کیا ہے کہ فطرت کائنات ایک خاص اندازے کے ساتھ ایک خاص اور مقرر قانون کے تحت بخشتی ہے۔

ربوبیت الٰہی نے پانی کے نظم و انتظام کا جو سامان کیا ہے اس کی کیفیت مولانا نے اس طرح بیان کی ہے کہ پہلے سورج کی شعاعیں سمندر سے ڈول بھر بھر کر فضا میں پانی کی چادریں بچھاتی ہیں، پھر ہواؤں کے جھونکے انہیں حرکت میں لاتے ہیں اور پانی کی بوندیں بنا کر ایک خاص وقت اور خاص محل میں برساتی ہیں چنانچہ پانی ایک خاص ترتیب و مقدار سے اس طرح برستا ہے کہ

زمین کی بالائی سطح پر وہ ایک خاص مقدار میں بہتا اور ایک خاص مقدار میں اندرونی حصوں تک پہنچتا ہے
اسی طرح پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف کے تودے جمتے ہیں جو موسم کی تبدیلی سے پگھلنے لگتے
ہیں، اس طرح پانی کے چشمے ابلنے لگتے ہیں اور دریا کی جدولیں بہنے لگتی ہیں جو پیچ و خم کھاتی ہوئی
دور تک دوڑ جاتی ہیں اور سینکڑوں اور ہزاروں میل تک وادیوں کو شاداب کر دیتی ہیں، مولانا
اس نظم و اہتمام اور ترتیب و انتظام کو کائنات ہستی میں ربوبیت الٰہی کی کار فرمائی کا نتیجہ بتاتے
ہیں، پانی پیدا کرنا خدا کی رحمت و حکمت ہے مگر اسے اس طرح کام میں لانا اور پرورش اور رکھوالی
کی تمام ضرورتیں پوری کرنا ربوبیت ہے۔

عناصر حیات

مولانا ربوبیت کے اس نظام کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ حسب ضرورت تمام عناصر حیات
فراہم کر دیئے گئے ہیں چنانچہ جن چیزوں کی زیادہ ضرورت ہے ان کی بخشائش بھی زیادہ اور عام
ہے مثلاً ہوا سب سے زیادہ ضروری ہے، پانی اور غذا کے بغیر بھی کچھ عرصہ تک زندگی ممکن
ہے، اس لئے ہوا سب سے زیادہ وافر اور عام چیز ہے، کوئی جگہ، کوئی گوشہ اور کوئی وقت بھی
اس سے خالی نہیں، فضا میں ہوا کا بے حد و کنار سمندر پھیلا ہوا ہے اس لئے زندگی کا یہ سب
سے زیادہ ضروری جوہر ہر جگہ اور ہر وقت خود بخود مہیا ہو جاتا ہے، ہوا کے بعد پانی ضروری
ہوتا ہے کیوں کہ :-

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ — اور (ہم نے) پانی سے تمام جاندار
(الانبیاء۔ ۳۰) — چیزیں پیدا کر دیں۔

اس لئے ہوا کے بعد سب سے زیادہ اس کی بخشائش کی فراوانی و عمومیت ہے، زمین کے
نیچے آب شیریں کی سوتیں بہہ رہی ہیں اس کے اوپر بھی ہر طرف دریا رواں ہیں۔ فضائے آسمانی
کا کارخانہ بھی شب و روز اس کے لئے سرگرم کار رہتا ہے جو سمندر کا شوراب کھینچ کر اسے صاف و

شیریں بنا کر حسب ضرورت زمین کے حوالے کر دیتا ہے، ہوا اور پانی کے بعد غذا کی زیادہ ضرورت
ہوتی ہے اس لئے ان کے بعد ہر چیز سے زیادہ اس کا دستر خوان کرۂ خشکی و تری میں بچھا ہوا ہے
اور ہر مخلوق کے گرد و پیش اس کا ذخیرہ موجود رہتا ہے۔

نظام پرورش

مولانا ارشاد فرماتے ہیں کہ دنیا میں پرورش کا عالمگیر نظام قائم ہے اور یہ کارخانۂ
عالم پروردگی کی آغوش اور بخشش حیات کا سرچشمہ بنا ہوا ہے، سورج روشنی کے لئے چراغ اور
گرمی کے لئے تنور کا کام دیتا ہے اور اپنی کرنوں کے ڈول بھر کر سمندر سے پانی کھینچتا ہے، ہوائیں
سردی اور گرمی کے مطلوبہ اثرات پیدا کرتی ہیں، کبھی پانی کے ذرات جما کر ابر کی چادریں بناتی ہیں،
اور کبھی ابر کو پانی بنا کر بارش برساتی ہیں، زمین نشو و نما کے خزانوں سے معمور رہتی ہے اور دانے کے
لئے اپنی گود میں زندگی اور ہر پودے کے لئے اپنے سینہ میں پروردگی رکھتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ ہر وجود کو بڑھنے اور نشو و نما پانے کے لئے پورا کارخانہ ہستی اس کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ مولانا
کہتے ہیں کہ سورج کی تمام کار فرمائیاں، فضا کے تمام تغیرات، زمین کی تمام قوتیں، عناصر کی تمام
سرگرمیاں صرف اسی انتظار میں رہتی ہیں کہ ایک چیونٹی کے انڈے سے کب ایک بچہ پیدا ہوتا ہے
اور دہقاں کی جھولی سے کب ایک دانہ زمین پر گرتا ہے، اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے
وہ یہ آیت نقل کرتے ہیں۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ — اور آسمان و زمین جو کچھ بھی ہے سب کو اللہ
وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِنْهُ إِنَّ فِي — نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے، بلاشبہ ان
ذٰلِكَ لَآيٰتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ — لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرنے والے ہیں
(جاثیہ۔ ۱۳) — اس بات میں (معرفت حقیقت کی) بڑی ہی
نشانیاں ہیں۔

نظام ربوبیت کی وحدت

مولانا آزاد نظام ربوبیت کی یکسانیت اور ہم آہنگی کو سب سے زیادہ عجیب مگر سب سے زیادہ نمایاں حقیقت بتاتے ہیں کیوں کہ ہر وجود کی پرورش کا سروسامان ہر گوشہ میں ایک ہی انداز میں کیا گیا ہے اور ایک ہی اصل و قاعدہ بھی رکھتا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"پتھر کا ایک ٹکڑا تمہیں گلاب کے شاداب اور عطر بیز پھول سے کتنا ہی مختلف دکھائی دے لیکن دونوں کی پرورش کے اصول و احوال پر نظر ڈالو گے تو صاف نظر آجائے گا کہ دونوں کو ایک ہی طریقے سے سامانِ پرورش ملا ہے اور دونوں ایک ہی طرح پالے پوسے جا رہے ہیں، انسان کا بچہ اور درخت کا پودا تمہاری نظروں میں کتنی بے جوڑ چیزیں ہیں، لیکن اگر ان کی نشو و نما کے طریقوں کا کھوج لگاؤ گے تو دیکھ لو گے کہ قانون پرورش کی یکسانیت نے دونوں کو ایک ہی رشتے میں منسلک کر دیا ہے، پتھر کی چٹان ہو یا پھول کی کلی، انسان کا بچہ ہو یا چیونٹی کا انڈا سب کے لئے پیدائش ہے اور قبل اس کے کہ پیدائش ظہور میں آئے سامان پرورش مہیا ہو جاتا ہے، پھر طفولیت کا دور ہے اور اس دور کی ضروریات ہیں انسان کا بچہ بھی اپنی طفولیت رکھتا ہے، درخت کے مولود نباتی کے لئے بھی طفولیت ہے اور تمہاری چشم ظاہر بیں کے لئے کتنا ہی عجیب کیوں نہ ہو، لیکن پتھر کی چٹان اور مٹی کا تودہ بھی اپنی اپنی طفولیت رکھتا ہے، پھر طفولیت رشد و بلوغ کی طرف بڑھتی ہے اور جوں جوں بڑھتی جاتی ہے اس کی روز افزوں حالت کے مطابق یکے بعد دیگرے، سامانِ پرورش میں بھی تبدیلیاں ہوتی جاتی ہیں. یہاں تک کہ ہر وجود اپنے سن کمال تک پہنچ جاتا ہے اور جب سنِ کمال تک پہنچ گیا تو از سر نو ضعف و انحطاط کا دور شروع ہو جاتا ہے، پھر اس ضعف و انحطاط کا خاتمہ بھی سب کے لئے ایک ہی طرح ہے، کسی دائرے میں اسے مرجانا کہتے ہیں، کسی میں مرجھا جانا اور

کسی میں پامال ہو جانا، الفاظ متعدد ہوگئے مگر حقیقت میں تعدد نہیں ہوا۔"

(ترجمان القرآن ج ۱ ص ۸۴)

پرورش کے لئے ہر وجود کو غذا کی ضرورت ہوتی ہے، مولانا اس بارے میں بتاتے ہیں کہ حیوانات میں بعض کے بچے دودھ سے پرورش پاتے ہیں اور بعض کے عام غذاؤں سے، لیکن وہ کہتے ہیں کہ دونوں کی پرورش کے لئے نظام ربوبیت نے کیا عجیب سروسامان مہیا کر دیا ہے، انسانوں کے بچے بھی دودھ ہی سے پرورش پاتے ہیں اس لئے مولانا انسان کو اپنی ہی ہستی کا مطالعہ کرنے کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ جوں ہی پیدا ہوتا ہے اس کی غذا اپنی ساری خاصیتوں، مناسبتوں اور شرطوں کے ساتھ خود بخود مہیا ہو جاتی ہے اور حالتِ طفولیت کے لحاظ سے اس کے لئے جو جگہ سب سے زیادہ قریب اور موزوں تر تھی وہاں مہیا کر دی، جوش محبت میں ماں اسے سینے سے لگا لیتی ہے اور وہیں اس کی غذا کا سرچشمہ بھی موجود ہوتا ہے۔

مولانا اس سلسلہ میں غذا کی نوعیت و مزاج میں درجہ بدرجہ بچہ کی حالت کے لحاظ سے یکے بعد دیگرے تبدیلی کا ذکر کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ابتدا میں معدہ بہت کمزور ہوتا ہے اس لئے اسے بہت ہلکے قوام کا دودھ چاہیئے اور انسان ہی نہیں تمام حیوانات میں بھی اس طرح کا دودھ ماں کا ہوتا ہے لیکن عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ جوں جوں معدہ قوی ہوتا ہے تو دودھ کا قوام بھی بدلتا جاتا ہے اور مائیت کے مقابلہ میں دہنیت بڑھتی ہے یہاں تک کہ رضاعت کا دور مکمل ہو جاتا ہے اور معدہ عام غذا ہضم کرنے کے قابل ہو جاتا ہے تو ماں کا دودھ خشک ہو جاتا ہے، یہ ربوبیتِ الٰہی کا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اب اس کے لئے دودھ کی ضرورت نہیں رہی، وہ ہر قسم کی غذائیں استعمال کر سکتا ہے۔

پھر وہ ربوبیتِ الٰہی کی اس کارسازی پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں کہ ماں کی فطرت میں

بچے کی جو محبت اور مامتا ہے وہ طبیعت بشری کا سب سے قوی اور پُر جوش جذبہ ہے.
چنانچہ جس بچہ کی پیدائش اس کی زندگی کی سب سے بڑی مصیبت تھی :-

حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ كُرۡهًا وَّ وَضَعَتۡهُ كُرۡهًا (احقاف ـــ ۱۵)
اس کی ماں نے اسے تکلیف کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور تکلیف کے ساتھ جنا۔

مولانا فرماتے ہیں کہ اسی کی محبت اس کے اندر زندگی کا سب سے بڑا جذبہ مشتعل کر دیتی ہے اور بچے کے سن بلوغ کو پہنچنے تک وہ اپنے لئے نہیں بچے کے لئے زندہ رہنا چاہتی ہے، اس پر ایسی خود فراموشی طاری ہوتی ہے کہ وہ ہر راحت و آسایش کو اس کے لئے قربان کر دیتی ہے، حبِ ذات کا سب سے زیادہ طاقتور جذبہ بھی مضمحل ہو جاتا ہے. مولانا کا بیان ہے کہ بچے کے مجنونانہ عشق میں اپنی زندگی کی قربانی دے دینا فطرتِ مادری کا معمولی واقعہ ہے جو ہمیشہ پیش آتا رہتا ہے۔

مولانا کارساز فطرت کی اس کرشمہ سازی کو بھی مدِ نظر رکھنے کی تلقین فرماتے ہیں کہ بچے کی عمر بڑھنے کے ساتھ محبتِ مادری کا شعلہ خود بخود دھیما پڑ جاتا ہے. وہ کہتے ہیں کہ حیوانات میں تو یہ بالکل ہی بجھ جاتا ہے اور انسان میں بھی اس کی گرمجوشی باقی نہیں رہتی، مولانا کے نزدیک یہ نظامِ ربوبیت کی کارفرمائی اور مقتضا ہے کہ اس نے بچے کی پرورش کا ذریعہ ماں کے جذبہ محبت میں رکھ دیا تھا اور عمر کے ساتھ جب پرورش کی احتیاج نہیں رہی تو یہ ذریعہ بھی باقی نہیں رہا کیوں کہ اب یہ ماں کے لئے بوجھ اور بچے کے لئے رکاوٹ ہوتا اس سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ فطرت نے محبت مادری کا دامن بچے کی احتیاج پرورش سے باندھ دیا تھا
انڈوں سے پیدا ہونے والے بچوں کے متعلق وہ بتاتے ہیں کہ ان کی جسمانی ساخت مختلف ہوتی ہے اس لئے وہ پہلے دن سے معمولی غذائیں کھاتے ہیں البتہ ان کو کھلانے کے لئے ایک

شفیق نگراں کی ضرورت ہے چنانچہ انڈا سے نکلتے ہی جب وہ غذا ڈھونڈتا ہے تو ماں اسے چن چن کر اس کے سامنے ڈالتی ہے اور منہ میں لے کر کھانے کی تلقین کرتی ہے بخود اپنے منہ میں لے کر غذا کو نرم اور ہلکا بنا کر محفوظ رکھتی ہے اور جب بچہ غذا کے لئے منہ کھولتا ہے تو اس میں اتار دیتی ہے۔

ربوبیتِ معنوی | اس سے بھی عجیب تر مولانا نظامِ ربوبیت کے معنوی پہلو کو بتاتے ہیں کیونکہ ان کے بقول خارج میں زندگی اور پرورش کا یہ سر و سامان اسی وقت مفید ہو سکتا ہے جب ہر وجود کے اندر اس سے کام لینے کی ٹھیک ٹھیک استعداد ہو، وہ فرماتے ہیں کہ یہ ربوبیت کا فیضان ہے کہ ہر مخلوق کی ظاہری و باطنی بناوٹ کی ہر قوت اس کے سامان پرورش کی نوعیت کے مطابق ہوتی ہے اور اسے زندہ رکھنے اور نشو نما پانے میں معاون ہوتی ہے اس کے جسم و قویٰ کی نوعیت اس کے حالات پرورش کے مقتضیات کے خلاف نہیں ہوتے.

مولانا اس بارے میں مشاہدہ و تفکر میں نمایاں آنے والی دو باتوں کی طرف قرآن حکیم کے توجہ دلانے کا ذکر کرتے ہیں۔

ا۔ تقدیر | ان کے نزدیک اس کے معنی اندازہ کر دینے اور کسی چیز کے لئے کمیت یا کیفیت میں ایک خاص طرح کی حالت ٹھہرا دینے کے ہیں، ان کے خیال میں فطرت نے ہر چیز کی جسمانی ساخت اور معنوی قویٰ کے لئے ایک خاص طرح کا جو اندازہ ٹھہرا دیا ہے اس سے وہ باہر نہیں جا سکتی اور یہ زندگی و نشو و نما کے تمام احوال و ظروف کے ٹھیک مناسب ہوتا ہے۔

وَخَلَقَ كُلَّ شَيۡءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقۡدِيۡرًا
اور اس نے تمام چیزیں پیدا کیں، پھر ہر چیز کے لئے (اس کی حالت اور ضرورت کے مطابق) ایک خاص اندازہ ٹھہرا دیا۔

مولانا کے نزدیک ہر پیدا ہونے والی چیز کی مطابقت اس کے گرد و پیش سے غیر متغیر قانونِ خلقت ہے اس لئے ہر مخلوق کی ظاہری بناوٹ اس کے گرد و پیش کے لحاظ سے ہوتی ہے یہ خدائے حکیم کی ٹھہرائی ہوئی تقدیر و اندازہ ہے جو حیوانات و نباتات ہی میں نہیں کائنات کی ہر چیز کے لئے ہے، ستاروں کا نظام گردش بھی تقدیر کی حد بندی پر ہے۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (یٰسین ۔ ۳۸)

اور (دیکھو) سورج کے لئے جو قرارگاہ ٹھہرا دی گئی ہے وہ اسی پر چلتا ہے اور یہ عزیز و علیم خدا کی اس کے لئے تقدیر ہے۔

مولانا کا خیال ہے کہ مخلوقات اور اس کے گرد و پیش میں مطابقت کے قانون نے دونوں میں باہم دگر مناسبت پیدا کر دی ہے اس لئے ہر مخلوق کے چاروں طرف اس کی پرورش اور نشو و نما کا سامان ہوتا ہے۔

مولانا اس کی بعض مثالیں دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پرند کا جسم اڑنے والا، مچھلی کا تیرنے والا، چارپایوں کا چلنے والا اور حشرات کا رینگنے والا ہے، اس لئے ہر نوع کا گرد و پیش ویسا ہی ہے جو اس کے جسم کے لئے موزوں ہے، پرند کی پرورش کے لئے دریا کا گرد و پیش مفید نہیں اس لئے وہ دریا میں نہیں پیدا ہوتا اسی طرح آبی جانوروں مچھلیوں کے لئے خشکی موزوں نہیں اس لئے اس میں یہ نہیں پیدا ہوتے فطرت کی تقدیر کے خلاف ایک خاص گرد و پیش کی مخلوق دوسری قسم کے گرد و پیش میں جانے کے بعد زندہ نہیں رہتی اور اگر رہتی ہے تو بہ تدریج اس کی جسمانی ساخت اس کے گرد و پیش کے مطابق ہو جاتی ہے، یہاں ایک اور نکتہ کا مولانا ذکر کرتے ہیں جو یہ ہے کہ

"ہر نوع کے لئے مقامی موثرات کے مختلف گرد و پیش ہیں اور ہر گرد و پیش کا

یہی حال ہے، سرد آب و ہوا کی پیداوار سرد آب و ہوا کے لئے ہے، گرم کی گرم کے لئے، قطب شمالی کے قرب و جوار کا ریچھ خطِ استوا کے قرب میں نظر نہیں آسکتا اور منطقہ حارہ کے جانور منطقہ باردہ میں معدوم ہیں۔"

(ترجمان القرآن جلد اوّل صـ۴۴)

۲۔ ہدایت مولانا کے نزدیک دوسری چیز ہدایت ہے جس کے معنی راہ دکھانے، راہ پر لگا دینے اور رہنمائی کرنے کے بتاتے ہیں، اس کے مختلف مراتب ہیں مگر یہاں وہ صرف تمام مخلوقات پر پرورش کی راہیں کھولنے والے مرتبہ ہدایت کی وضاحت کرتے ہیں جو زندگی کو راہ پر لگاتا، ضروریاتِ زندگی کی طلب و حصول میں رہنمائی کرتا ہے وہ اسے ربوبیت کی ہدایت بتاتے ہیں جس کی دستگیری کے بغیر کوئی مخلوق دنیا کے سامانِ حیات و پرورش سے نہ فائدہ اٹھا سکتی ہے اور نہ زندگی کی سرگرمیاں ظہور میں آسکتی ہیں۔ مولانا اسی کو از روئے قرآن وجدان کا فطری الہام اور حواس و ادراک کی قدرتی استعداد بتاتے ہیں۔

وجدان کی ہدایت مولانا فرماتے ہیں کہ ہر مخلوق کے مزاج و طبیعت میں ایک ایسا پوشیدہ الہام موجود ہے جو اسے زندگی اور پرورش کی راہوں پر خود بخود لگا دیتا ہے اور وہ باہر کی رہنمائی و تعلیم کی محتاج نہیں ہوتی، انسان و حیوان کا بچہ جیسے ہی شکم مادر سے باہر آتا ہے اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی غذا ماں کے سینے میں ہے، مولانا بتاتے ہیں کہ عالم ہستی میں بھی ابھی قدم رکھنے والا بچہ وجدانی ہدایت سے معلوم کر لیتا ہے کہ اس کی غذا کا سرچشمہ ماں کا پستان ہے، حواس و ادراک کی روشنی نمودار ہونے سے پہلے یہ وجدانی ہدایت اس کے کان میں پھونک دیتی ہے کہ وہ اپنی غذا حاصل کرنے کے لئے پستان منہ میں لے لے۔ مولانا نے اس موقع پر اس بلّی کی مثال دی ہے جو پہلی مرتبہ بچہ جننے والی ہوتی ہے اور بغیر پچھلے تجربہ کے وضع حمل کے وقت تیاری و حفاظت کی سرگرمیاں شروع کر دینے کیلئے اسے کوئی چیز آمادہ کر دیتی ہے اور کسی محفوظ گوشہ

کی جستجو شروع کر دیتی ہے، یہ مضطرب الحال بلّی مکان کا ہر گوشہ اور کونہ دیکھتی ہے اور آخر میں بچّہ جننے کے لئے ایک محفوظ اور علیحدہ گوشہ چھانٹ لیتی ہے، پھر بچے کی حفاظت کی طرف سے مجہول خطرہ پیدا ہونے پر یکے بعد دیگرے اپنی جگہ بدلتی رہتی ہے تاکہ بلا جو بچوّں کا دشمن ہے ان کی بو نہ سونگھ سکے۔ مولانا ربوبیتِ الٰہی کی اس وجدانی ہدایت کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ وہ الہام ہے جو ہر مخلوق کے اندر اپنی نمود رکھتا اور اس پر زندگی اور پرورش کی تمام راہیں کھول دیتا ہے۔

حواس و ادراک کی ہدایت مولانا فرماتے ہیں کہ دوسرا مرتبہ ہدایت حواس و مدرکات ذہنی کا ہے، ان کے نزدیک فطرت نے فکر و عقل سے محروم حیوانات کو بھی احساس و ادراک کی وہ تمام قوتیں دے دی ہیں جن کی زندگی و معیشت کے لئے ضرورت تھی تاکہ وہ اپنے رہنے سہنے، کھانے پینے، توالد و تناسل اور حفاظت و نگرانی کے تمام وظائف حسن و خوبی سے انجام دیں، مولانا یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ ہدایت ایک ہی طرح کی نہیں ہے بلکہ ہر حیوان کو ویسی ہی استعداد دی گئی ہے جیسی اس کے احوال و ظروف کے لئے ضروری تھی، چیونٹی کی قوتِ شامہ دور رس ہوتی ہے، اس سے وہ اپنی غذا حاصل کر سکتی ہے، چیل اور عقاب کی نگاہ تیز ہوتی ہے تاکہ بلندی میں اڑتے ہوئے وہ اپنا شکار دیکھ سکیں۔

مولانا نے اسی مرتبہ ہدایت کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ قرآن نے اسے ربوبیت الٰہی کی وحی کہا ہے جس کے معنی مخفی ایماء و اشارہ کے ہیں یعنی فطرت کی وہ اندرونی سرگوشی جو ہر مخلوق پر اس کی راہِ عمل کھول دیتی ہے۔

وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ

اور (دیکھو) تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ان ٹٹیوں میں جو

اس غرض سے بلند کی جاتی ہیں کہ اپنے لئے چھتے بنائے۔ (النحل - ۶۸)

ان کے خیال میں حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے جواب میں بھی ربوبیتِ الٰہی کی ہدایت کی طرف یوں اشارہ کیا ہے۔

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (طٰهٰ: ۵۰)

ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی بناوٹ دی پھر اس پر (زندگی و معیشت) کی راہ کھول دی۔

ان کے نزدیک ثُمَّ السَّبِیْلَ یَسَّرَهٗ (اللہ نے انسان کے لئے زندگی و عمل کی راہ آسان کر دی) بھی اسی حقیقت کی تعبیر ہے، مولانا یہ بھی بتاتے ہیں کہ تکوینِ وجود کے جو چار مرتبے اس آیت میں بیان کئے گئے ہیں۔

الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی (اعلیٰ - ۲ و ۳)

وہ پروردگار عالم جس نے پیدا کیا، پھر اسے ٹھیک ٹھیک درست کر دیا اور جس نے ہر وجود کے لئے ایک اندازہ ٹھہرا دیا پھر اس پر راہ (عمل) کھول دی۔

ان میں تخلیق و تسویہ کے بعد تیسرا مرتبہ تقدیر اور چوتھا ہدایت ہے۔

براہینِ ربوبیت ربوبیت کے ان پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کرنے کے بعد وہ قرآن مجید کے جا بجا خدا کی ہستی اور اس کی توحید و صفات پر نظامِ ربوبیت سے استدلال کا ذکر کرتے ہیں اور اسے اس کے اہم دلائل میں سے بتاتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اس نے مظاہر کائنات کے جن مقاصد و مصالح سے استدلال کیا ہے ان میں ربوبیتِ الٰہی کا استدلال سب سے زیادہ عام

ہے اور اس کو وہ برہانِ ربوبیت کا نام دیتے ہیں اور اسے براہین قرآنیہ کا مبدأ استدلال قرار
دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"کائنات کے تمام اعمال و مظاہر کا اس طرح واقع ہونا کہ ہر چیز پرورش کرنے
والی اور ہر تاثیر زندگی بخشنے والی ہے اور پھر ایک ایسے نظام ربوبیت کا موجود
ہونا جو ہر حالت کی رعایت کرتا اور ہر طرح کی مناسبت ملحوظ رکھتا ہے، ہر انسان کو
وجدانی طور پر یقین دلا دیتا ہے کہ ایک پروردگار عالم ہستی موجود ہے اور وہ ان
تمام صفتوں سے متصف ہے جن کے بغیر نظامِ ربوبیت کا یہ کامل اور بے عیب کارخانہ
وجود میں نہیں آسکتا۔" (ترجمان القرآن جلد اول صفحہ ۵)

مولانا کے نزدیک انسان کا وجدان اس کو باور نہیں کرسکتا کہ نظامِ ربوبیت کا یہ پورا
کارخانہ خود بخود وجود میں آجائے اور اس کے اندر کوئی زندگی، کوئی ارادہ اور کوئی حکمت
کارفرما ہو، وہ اس کو نا ممکن بتلاتے ہیں کہ پروردگار اور کارساز کے بغیر کارخانہ ہستی کی ہر
چیز میں ایک بولتی ہوئی پروردگاری اور ایک ابھری ہوئی کارسازی موجود ہو، ان کے
نزدیک محض ایک اندھی بہری فطرت، بے جان مادہ اور بے حس الکٹرون سے پروردگاری اور
کارسازی کا یہ پورا کارخانہ ظہور میں نہیں آسکتا۔ جب تک کہ عقل و ارادہ رکھنے والی ہستی
موجود نہ ہو، ان کے خیال میں نہ انسان کی فطرت اس کو تسلیم کرسکتی ہے اور نہ اس کا وجدان
اس کو مان سکتا ہے کہ پروردگاری ہو مگر کوئی پروردگار نہ ہو، کارساز کے بغیر کارسازی
موجود ہو، حکیم نہ ہو مگر حکمت موجود ہو، سب کچھ ہو مگر کوئی موجود نہیں، عامل کے بغیر
عمل، ناظم کے بغیر نظم، قیوم کے بغیر قیام، نقاش کے بغیر نقش اور کسی کے بغیر سب کچھ موجود
کا تصور مولانا محال قرار دیتے ہیں۔

وہ قرآن مجید کی روشنی میں اس حقیقت کو بھی واضح کرتے ہیں کہ نظامِ ربوبیت کا مطالعہ
کرنے والے کے اندر ایک رب العالمین ہستی کا یقین جاگ نہ اٹھنا انسان کے وجدانی اذعان
کے خلاف ہے آدمی غفلت کی سرشاری اور سرکشی کے ہیجان میں چاہے ہر چیز سے انکار کر
دے مگر اپنی فطرت سے انکار نہیں کرسکتا، ان کے خیال میں وہ ہر چیز کے خلاف جنگ کر
سکتا ہے مگر اپنی فطرت کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھا سکتا، مولانا کا بیان ہے کہ جب انسان
اپنے چاروں طرف زندگی اور پروردگاری کا پھیلا ہوا ایک عالمگیر کارخانہ دیکھتا ہے تو
اس کی فطرت یہ صدا دیتی ہے اور اس کے دل کے ایک ایک ریشہ میں یہ اعتقاد سما جاتا ہے
کہ ایک پروردگار ہستی موجود ہے جس کی یہ سب کچھ کرشمہ سازیاں ہیں۔

مولانا فرماتے ہیں کہ کائنات ہستی کے سروسامان پرورش اور نظامِ ربوبیت کی کارسازیوں
کا ذکر قرآن مجید میں بے شمار مقامات میں ہوا ہے، ان سب میں استدلال کا یہی پہلو نمایاں
ہے، اس سلسلہ کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ
أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا
الْأَرْضَ شَقًّا فَأَنبَتْنَا فِيهَا حَبًّا
وَعِنَبًا وَقَضْبًا وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا
وَحَدَائِقَ غُلْبًا وَفَاكِهَةً وَأَبًّا
مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ۔
(عبس ۲۴ تا ۳۲)

انسان اپنی غذا پر نظر ڈالے (جو شب روز
اس کے استعمال میں آتی رہتی ہے) ہم پہلے زمین
پر پانی برساتے ہیں، پھر اس کی سطح شق کر دیتے
ہیں، پھر اس کی روئیدگی سے طرح طرح کی چیزیں
پیدا کر دیتے ہیں، اناج کے دانے، انگوروں کی بیلیں،
کھجور کے خوشے، سبزی، ترکاری، زیتون کا تیل،
درختوں کے جھنڈ، قسم قسم کے میوے، طرح طرح
کا چارہ (اور یہ سب کچھ کس کے لئے؟) تمہارے

فائدے کے لئے اور تمہارے جانوروں کے لئے

وہ فلینظر الانسان کے زور پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ غافل اور اعراض کرنے والے سے بھی دلائل حقیقت کی وسعت و ہمہ گیری اوجھل نہیں ہوسکتی. انسان تمام دنیا سے آنکھیں بند کرسکتا ہے لیکن اپنی شب و روز کی غذا کی طرف سے آنکھیں نہیں بند کرسکتا۔ وہ فرماتے ہیں کہ گیہوں کے دانہ کی پیدائش سے پختگی و تکمیل کے تمام احوال و ظروف پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کارخانہ ہستی کے ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ اس کی بناوٹ میں سرگرم رہنے ہی سے یہ حقیر سا ایک دانہ وجود میں آیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیا میں نظام ربوبیت موجود ہے اور جب وہ ہے تو ربوبیت رکھنے والی ہستی بھی موجود ہے.

دنیا میں ہر چیز مخلوق ہے اس لئے قرآن مجید نے جابجا اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ دنیا میں خالق کا ہونا بھی ضروری ہے. مولانا کہتے ہیں کہ خلقت ہی کی طرح قرآن مجید ربوبیت سے بھی استدلال کرتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز مربوب ہے اس لئے رب کا ہونا بھی ضروری ہے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جس طرح دنیا میں الوہیت کامل اور بے داغ ہے اسی طرح رب کے لئے بھی کامل اور بے داغ ہونا ضروری ہے اس کو زیادہ واضح لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ جب دنیا میں ہر چیز کو پرورش کی احتیاج ہے اور وہ اسے مل رہی ہے تو پرورش کرنے والا بھی موجود ہونا چاہئے۔ ظاہر ہے جو خود پرورده اور محتاجِ پروردگاری ہو وہ پرورش کرنے والا نہیں ہوسکتا.

نظام ربوبیت سے توحید پر استدلال

توحید پر نظام ربوبیت سے قرآن مجید نے جابجا استدلال کیا ہے. مولانا اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ جو رب العالمین تمام کائنات کی پرورش کر رہا ہے اور جس کی ربوبیت کا اعتراف انسان کے دل کے ایک ایک ریشہ میں ہے اسی کے آگے بندگی و

نیاز کا سر جھک سکتا ہے اس کو ثابت کرنے کے لئے قرآن مجید نے جو مثالیں دی ہیں ان میں سے ایک مثال ملاحظہ ہو۔

يَآاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ
الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ الَّذِىْ
جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا
وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ
مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرَاتِ
رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ
اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔

(بقرہ : ۳۱)

اے افراد انسانی! اپنے پروردگار کی عبادت کرو، اس پروردگار کی جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان سب کو بھی پیدا کیا جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور اس لئے پیدا کیا تاکہ تم برائیوں سے بچو۔ وہ پروردگار عالم جس نے تمہارے لئے زمین فرش کی طرح بچھادی اور آسمان چھت کی طرح بنادیا اور آسمان سے پانی برسایا پھر اس سے طرح طرح کے پھل پیدا کردیے تاکہ تمہارے لئے رزق کا سامان ہو، (پس جب خالقیت اسی کی خالقیت اور ربوبیت اسی کی ربوبیت ہے تو) ایسا نہ کرو کہ کسی دوسری ذات کو اس کا ہم پلہ ٹھہراؤ اور تم اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو۔

نظام ربوبیت سے وحی و رسالت پر استدلال

وہ نظام ربوبیت کے اعمال سے انسانی سعادت و شقاوت کے معنوی قوانین اور وحی و رسالت کی ضرورت پر قرآن مجید کے استدلال کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ جس رب العالمین نے پرورش کے لئے ربوبیت کا ایسا نظام قائم کیا ہے کیا وہ روحانی فلاح و سعادت کے لئے کوئی نظام اور قاعدہ مقرر نہیں کرے گا، وہ کہتے

ہیں کہ جسم کی طرح روح کی بھی ضرورتیں ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ جسم کی نشوونما کے لیے تو اس کے پاس سب کچھ ہو لیکن روح کی نشوونما کے لیے اس کے پاس کوئی پروردگاری نہ ہو، ان کے نزدیک یہ بات کس قدر تعجب انگیز ہے کہ اس کی پروردگاری اجسام کی پرورش کے لیے آسمان سے پانی برسائے لیکن ارواح کی پرورش کے لیے اس کے پاس ایک قطرۂ فیض نہ ہو، وہ فرماتے ہیں کہ اس کا قانون ہے کہ جس طرح زمین شادابی سے محروم ہو کر مردہ ہو جاتی ہے تو بارانِ رحمت نمودار ہو کر زندگی کی برکتوں سے اس کے ذرے ذرے کو مالامال کر دیتی ہے، اسی طرح جب عالمِ انسانیت ہدایت و سعادت کی شادابیوں سے محروم ہو جاتا ہے تو اس کی بارانِ رحمت نمودار ہو کر ایک ایک روح کو پیامِ زندگی پہنچا دے۔

مولانا روحانی سعادت کی اس بارش کو وحیِ الٰہی کہتے ہیں۔ مردہ روحوں میں زندگی کی جنبش پیدا کر دینا اسی طرح تعجب خیز نہیں جس طرح پانی برسنے سے مردہ زمین کا زندہ ہو جانا، مولانا نے قرآن مجید کی اس طرح کی آیتیں نقل کر کے بتایا ہے کہ پروردگارِ عالم کی ربوبیت و رحمت کا یہ فیضان شب و روز جاری ہے، اس کے پاس جسمانی پرورش و ہدایت کی طرح روحانی پرورش و ہدایت کا بھی سروسامان ہے، وہ زمین کی موت کو زندگی سے بدلنے کی طرح روح کی موت کو بھی زندگی سے بدل دیتا ہے جب وہ ستاروں کی علامتوں سے خشکی و تری کی ظلمتوں میں رہنمائی کرتا ہے تو یقیناً روحانی زندگی کی تاریکیوں میں رہنمائی کی روشنی بھی اس کے پاس ہے، وہ کہتے ہیں کہ زمین پر کھیت کا لہلہانا اور آسمان میں تاروں کا چمکنا جب باعثِ حیرت نہیں تو نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے خدا کی وحی کا نازل ہونا کیسے تعجب خیز ہے، اگر یہ بات فہم سے بالاتر نہیں ہے کہ ایک چیونٹی کی پرورش کے لیے خدا نے یہ پورا کارخانہ حیات سرگرم رکھا ہے تو نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے وحی کا سلسلہ قائم ہونا کیسے ماورائے فہم ہو گیا؟

نظامِ ربوبیت سے معاد پر استدلال

مولانا اس سلسلہ میں پہلے یہ نکتہ کی بات بیان کرتے ہیں کہ زیادہ نگرانی و اہتمام سے بنائی جانے والی چیز زیادہ قیمتی استعمال اور اہم مقصد بھی رکھتی ہے اور بہتر صناع وہی ہے جو اپنی صنعت گری کا بہتر استعمال و مقصد رکھتا ہو، اس لئے کرۂ ارضی کی سب سے بہترین مخلوق انسان کا چند روزہ زندگی کے لئے بنایا جانا اور بہتر استعمال اور بلند تر مقصد نہ رکھنا ممکن نہیں جس کی جسمانی و ذہنی نشوونما کے لئے فطرت کائنات نے اتنا اہتمام کیا ہے کیونکہ خالق کائنات رب ہے اور کامل درجہ کی ربوبیت رکھتا ہے۔ اس لئے وہ بہترین مربوب کو مہمل اور بے نتیجہ نہیں چھوڑ سکتا۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ، فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ۔ (مومنون ۱۱۵-۱۱۶)	کیا تم نے ایسا سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں بغیر کسی مقصد و نتیجہ کے پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹنے والے نہیں، اللہ جو اس کائناتِ ہستی کا حقیقی حکمراں ہے اس سے بہت بلند ہے کہ ایک بیکار و عبث فعل کرے، کوئی معبود نہیں ہے مگر وہ جو (جہانداری کے) عرشِ بزرگ کا پروردگار ہے۔

یہ مطلب کا سادہ طریقہ بیان تھا۔ آگے انہوں نے علمی بحث و تقریر کا جو پیرایہ اختیار کیا ہے اس کو ہم قلم انداز کرتے ہیں، ممکن ہے اس میں نظریہ ارتقا کی جھلک آگئی ہو، ان کے استدلال کا بنیادی نقطہ تو یہی ہے کہ جس وجود کی پیدائش کے لیے اتنا اہتمام کیا گیا ہو وہ صرف اس لیے نہیں ہو سکتا کہ پیدا ہو کر اور کھا پی کر مر جائے اور فنا ہو جائے کیوں کہ فتعالی اللہ الملک الحق لا الٰہ الا ھو رب العرش الکریم۔ مگر اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ

چونکہ وجود حیوانی ماضی میں یکے بعد دیگرے بدلتا اور ترقی کرتا رہتا ہے اس لئے مستقبل میں بھی یہ تغیر وارتقا جاری رہے گا، کیونکہ جب ماضی میں بیشمار صورتوں کے مٹنے اور نئی زندگیوں کے ظہور میں آنے پر کوئی تعجب نہیں کیا جاتا تو اس پر کیوں تعجب کیا جائے کہ موجودہ زندگی بھی مٹنے کے بعد ایک اعلا تر صورت اور زندگی پائے گی۔

أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّن مَّنِيٍّ يُمْنَىٰ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّىٰ۔

(قیامہ ۳۶-۳۸)

کیا انسان خیال کرتا ہے کہ وہ مہمل چھوڑ دیا جائے گا (اور اس زندگی کے بعد دوسری زندگی نہ ہوگی) کیا اس پر یہ حالت نہیں گزر چکی ہے کہ پیدائش سے پہلے نطفہ تھا، پھر نطفہ سے علقہ ہوا (یعنی جونک کی سی شکل ہوگئی) پھر علقہ سے (اس کا ڈیل ڈول) پیدا کیا گیا پھر (اس ڈیل ڈول کو) ٹھیک ٹھیک درست کیا۔

وہ سورۂ ذاریات کی ابتدائی آیتوں کا حوالہ دیتے ہیں جن میں تمام تر جزا کا بیان ہے اور اس کے لئے اعمال ربوبیت ہواؤں کے چلنے اور پانی برسنے کے موثرات سے شہادت پیش کی گئی ہے اور آسمان و زمین کی بخشایشوں کے علاوہ وجود انسانی کی اندرونی شہادتوں پر توجہ دلانے کے بعد کہا گیا ہے۔

فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَا أَنَّكُمْ تَنطِقُونَ۔

(ذاریات-۲۳)

آسمان و زمین کے رب کی قسم (یعنی آسمان و زمین کے پروردگار کی پروردگاری شہادت دے رہی ہے) کہ بلاشبہ وہ معاملہ (یعنی

جزا و سزا کا معاملہ) حق ہے ٹھیک ٹھیک اسی طرح جس طرح یہ بات کہ تم گویائی رکھتے ہو۔

مولانا کے نزدیک عربی میں کسی بات پر شہادت کے لئے قسم لائی جاتی ہے اور یہاں اثبات جزا کے لئے اپنے وجود کی جو قسم کھائی ہے اس کے لئے رب کا لفظ آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پروردگار کی پروردگاری کی شہادت یہ ہے کہ یہ بات حق ہے اور ربوبیت کی شہادت ہے کہ پرورش موجود ہے، پروردہ موجود ہے اس لئے پروردگار بھی موجود ہے اور جزا کا معاملہ بھی موجود ہے اس لئے انسان کو بلا نتیجہ چھوڑنا ناممکن ہے۔

قرآن مجید کا طرز استدلال

مولانا نے قرآن مجید کے تصور ربوبیت اور اس کے دلائل کی وضاحت کرتے ہوئے کہیں کہیں قرآنی استدلال کی نوعیت اور اس کی خوبی و دلنشینی پر بھی بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ متکلمین کے انداز و اسلوب سے بالکل مختلف ہے، اس لئے اس پر بھی ایک نظر ڈال لینا مناسب ہوگا، اس کی اہمیت اس لئے ہے کہ قرآن مجید کے طریق استدلال کا اولین مبدأ تعقل و تفکر کی دعوت ہے، اس کی کوئی سورہ اور سورہ کا کوئی حصہ بھی تفکر و تعقل کی دعوت سے خالی نہیں، قرآن مجید کے نزدیک حقیقت شناسی کی راہ یہ ہے کہ انسان خدا کی دی ہوئی عقل و بصیرت سے کام لے اور اپنے وجود کے اندر اور اپنے وجود کے باہر جو کچھ محسوس کرے اس میں تدبر و تفکر کرے، وہ بتاتا ہے کہ انسان عقل و بصیرت کے ٹھیک ٹھیک استعمال کرنے اور نہ کرنے کے لئے جواب دہ ہے، اگر وہ غفلت و اعراض میں نہ مبتلا ہو تو زمین و آسمان کی ہر چیز اور ہر منظر میں اور زندگی کے ہر تغیر میں اس کے فکر کے لئے معرفت حقیقت کی نشانیاں ہیں۔

مولانا آزاد قرآنی استدلال کی خوبی یہ بتاتے ہیں کہ نظری مقدمات اور ذہنی مسلمات

کی شکلیں ترتیب دے کر اس پر بحث و تقریر کر کے وہ مخاطب کو رد و تسلیم پر مجبور نہیں کرتا بلکہ انسان کے فطری ذوق و وجدان کو مخاطب کرتا ہے اس کی دلیلیں محض ذہن و دماغ میں کاوش پیدا کرنے کے بجائے (انسان کے نہاں خانہ دل پر دستک دے کر اس کے فطری وجدان کو بیدار کر دیتی ہیں جس کے بعد اس کا وجدان ہی اسے مدعا تک پہنچا دے گا اور اثبات مدعا کے لئے بحث و تقریر کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خود انسان کی فطرت سے اس پر حجت لاتا ہے

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ ۔

(قیامہ۔ ۱۴)

بلکہ انسان کا وجود خود اس کے خلاف (یعنی اس کی کج اندیشیوں کے خلاف) حجت ہے اگرچہ وہ (اپنے وجدان کے خلاف) کتنے ہی عذر بہانے تراش لیا کرے۔

اسی لئے اس نے جا بجا فطرتِ انسانی کو مخاطب کر کے اس کی گہرائیوں سے جواب طلب کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا:۔

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَاۤ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِیَ

وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور جس نے آسمان سے تمہارے لئے پانی برسایا پھر اس آب پاشی سے خوشنما باغ اگا دیئے حالانکہ تمہارے بس کی یہ بات نہ تھی کہ ان باغوں کے درخت اگاتے۔ کیا (ان کاموں کا کرنے والا) اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود بھی ہے (افسوس ان لوگوں کی

وَجَعَلَ بَیْنَ الْبَحْرَیْنِ حَاجِزًا ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَیْ رَحْمَتِهٖ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۔

(النمل: ۶۰)

سمجھ پر حقیقت حال کتنی ہی ظاہر ہو) مگر یہ وہ لوگ ہیں جن کا شیوہ ہی کج روی ہے۔ اچھا بتلاؤ وہ کون ہے جس نے زمین کو (زندگی و معیشت کا) ٹھکانا بنا دیا اس کے درمیان نہریں جاری کر دیں۔ اس (کی درستگی) کے لئے پہاڑ بلند کر دیئے، دو دریاؤں میں (یعنی دریا اور سمندر میں ایسی) دیوار حائل کر دی (کہ دونوں اپنی اپنی جگہ محدود رہتے ہیں)، کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا بھی ہے؟ (افسوس کتنی واضح بات ہے) مگر ان لوگوں میں اکثر ایسے ہیں جو نہیں جانتے۔ اچھا بتلاؤ وہ کون ہے جو بے قرار دلوں کی پکار سنتا ہے جب وہ (ہر طرف سے مایوس ہو کر) اسے پکارنے لگتے ہیں اور ان کا درد دکھ ٹال دیتا ہے اور وہ کہ اس نے تمہیں زمین کا جانشین بنایا ہے، کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا بھی ہے (افسوس تمہاری غفلت پر!) بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تم نصیحت پذیر ہو۔ اچھا بتاؤ وہ کون ہے جو صحراؤں اور سمندروں کی

تاریکیوں میں تمہاری رہنمائی کرتا ہے۔ وہ
کون ہے جو بارانِ رحمت سے پہلے خوشخبری
دینے والی ہوائیں چلا دیتا ہے؟ کیا اللہ کے
ساتھ کوئی دوسرا بھی معبود ہے (ہرگز نہیں)
اللہ کی ذات اس ساجھے سے پاک و منزہ ہے
جو یہ لوگ اس کی معبودیت میں ٹھہرا رہے ہیں۔
اچھا بتلاؤ وہ کون ہے جو مخلوقات کی پیدائش
شروع کرتا ہے اور پھر اسے دہراتا ہے اور
وہ کون ہے جو آسمان و زمین کے کارخانہ ئے
رزق سے تمہیں روزی دے رہا ہے کیا اللہ
کے ساتھ کوئی دوسرا معبود بھی ہے (اے پیغمبر)
ان سے کہو اگر تم (اپنے رویہ میں) سچے ہو (اللہ
انسانی عقل و بصیرت کی اس عالمگیر شہادت
کے خلاف تمہارے پاس کوئی دلیل ہے) تو
اپنی دلیل پیش کرو۔

ایسے موقع پر اس کے ہر سوال کا ایک جواب ہوتا ہے جو فطرتِ انسانی کا عالمگیر اور مسلمہ اذعان ہے۔

قرآن کے استدلال کا طریقہ منطقی بحث و تقریر کا نہیں ہوتا ہے جس کے لیے چند در چند مقدمات وضع کرنا اور اثبات مدعا کی شکلیں ترتیب دینا ضروری ہوتا ہے بلکہ وہ ہمیشہ

براہ راست تلقین کا قدرتی اور سیدھا سادا طریقہ اختیار کرتا ہے، اس کے دلائل عموماً اس کے اسلوب بیان اور خطاب میں مضمر ہوتے ہیں، وہ ایسا اسلوب خطاب اختیار کرتا ہے جس سے استدلال کی روشنی نمودار ہوتی ہے کسی مطلب پر زور دیتے ہوئے ایسا لفظ لا دیتا ہے جس کی تعبیر ہی میں اس کی دلیل ہوتی ہے اس لئے مخاطب کا ذہن خود بخود اس کی طرف مائل ہو جاتا ہے مثلاً قرآن میں صفت ربوبیت کا جا بجا استعمال ہے۔ اور خدا کی ہستی کے ذکر کے لئے اسے وہ رب سے تعبیر کرتا ہے، اس سے جس طرح اس کی ایک صفت ظاہر ہوتی ہے اسی طرح اس کے رب ہونے کی دلیل بھی واضح ہو جاتی ہے، مولانا کے خیال میں اس طرح کے مخاطبات جہاں جہاں قرآن میں آئے ہیں ان کو مجرد امر و خطاب نہیں سمجھنا چاہئے بلکہ وہ خطاب و دلیل دونوں ہوتے ہیں۔

مولانا نے اس پر اظہار افسوس کیا ہے کہ متکلمین پر قرآن کا اسلوب استدلال اس لئے واضح نہیں ہوا کہ ان کی نظر اس پہلو پر نہیں تھی چنانچہ وہ دور دراز گوشوں میں بھٹک گئے۔ وہ مفسرین کے بارے میں بھی یہی کہتے ہیں کہ ان کی نظر اس حقیقت پر نہ تھی اور منطقی استدلال کے استغراق نے انہیں قرآن مجید کے طریق استدلال سے بے پروا کر دیا تھا اس کی وجہ سے قرآن کے اسلوب بیان کی حقیقی روح واضح نہ ہو سکی اور استدلال کا پہلو طرح طرح کی توجیہات میں گم ہو گیا، وہ بڑے دکھ اور درد سے فرماتے ہیں کہ مختلف اسباب سے مطالب قرآنی کا یہ گوشہ سب سے زیادہ مہجور ہو گیا ہے اس لئے حقیقت گم گشتہ کا از سر نو سراغ لگانا ضروری ہے۔

تحفۃ المجاہدین کا ایک مطالعہ

از
ڈاکٹر سید احتشام ندوی پروفیسر وصدر شعبہ عربی کالی کٹ یونیورسٹی کیرالا

تحفۃ المجاہدین جنوبی ہند کی تاریخ پر ایک بنیادی اہمیت کی حامل کتاب ہے۔ شیخ احمد زین الدین مالا باری متوفی سنہ ۹۹۱ھ نے اس میں مسلمانوں کے اس عظیم جہاد کی تاریخ بیان کی ہے جو انہوں نے ساحل مالا بار پر پرتگالیوں کے خلاف پوری جرأت اور شجاعت سے کیا تھا۔

یہ جہاد نہ صرف جنوبی ہند کے مسلمانوں کی تاریخ میں اہمیت رکھتا ہے بلکہ اس کے دور رس نتائج تاریخ اسلام پر اور مسلمانوں کی بحری طاقت پر منعکس ہوئے ہیں۔ دراصل یہ بحر عرب میں عربوں کی شکست اور یورپ کی سیادت کی داستان کا آغاز ہے۔ زمورن اُشاہ کالی کٹ، سلطان اور عرب (مصر) تینوں نے مل کر بحر عرب میں پرتگالیوں کا جو مقابلہ کیا تھا اور جس کے نتیجہ میں ان کو شکست کا سامنا کرنا پڑا، یہ معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس نے تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ مسلمانوں کے زوال وانحطاط کا اصل نقطہ آغاز یہی شکست ہے جس سے بحر العرب میں عربوں کی اور مسلمانوں کی سیادت ختم ہوگئی اور یورپی طاقتیں یکے بعد دیگرے بحری اور سیاسی قوت حاصل کرتی رہیں۔ مصنف شیخ احمد زین الدین معبری مالا باری نے تحفۃ المجاہدین میں تاریخ وار مسلمانوں اور پرتگالیوں کی مسلسل جنگوں کی داستان بیان کی ہے اور تفصیل کے ساتھ پرتگالیوں کے مظالم کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ واسکو ڈی گاما کو ساحل مالا بار تک پہنچانے والا مشہور ماہر بحریات احمد بن ماجد تھا۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے عرب و ہند کے تعلقات میں

اس واقعہ کا ذکر کیا ہے اور تحفۃ المجاہدین میں بھی یہ واقعہ موجود ہے۔ علامہ ندویؒ نے لکھا ہے کہ ابن ماجد نے نشہ کی حالت میں پرتگالیوں کی رہنمائی کی۔ یہ کس طرح ہوا اس کی تفصیل گو یہاں درج نہیں کی ہے مگر انہوں نے عربوں کی جہاز رانی میں اس کی تفصیل یہ بتائی ہے کہ نشہ کی حالت میں اس سے صحیح راستہ دریافت کر لیا اور ہندوستان پہنچنے کا نقشہ معلوم کر لیا۔[1]

واقعہ یہ ہے کہ مصنف نے ان تاریخی واقعات کا ذکر قدرے تفصیل سے کیا ہے جو مالا بار میں سنہ ۹۰۴ھ سے سنہ ۹۹۱ھ تک پیش آئے۔ مسلمانوں سے پرتگال کی کشمکش اتفاقی نہ تھی بلکہ وہ ایک منصوبہ کے مطابق افریقہ اور ایشیا کے جزیروں کو فتح کر کے مالا بار تک پہنچا تھا۔ چونکہ بحر عرب اور بحر احمر پر عربوں کا قبضہ تھا اور ساحلوں پر مسلم آبادیاں تھیں اس بنا پر پرتگال کو سب سے پہلے انہیں مسلمانوں سے نپٹنا پڑا جو ساحلوں پر آباد تھے اور سمندر میں ان کو سیادت حاصل تھی۔ جس وقت پرتگالی ساحل مالا بار پر پہنچے، اس وقت صورت حال یہ تھی کہ دکن میں پانچ مسلم حکومتیں قائم تھیں۔ دہلی میں ہمایوں ایران سے واپس آکر دوبارہ سریر آرائے حکومت تھا۔ گجرات میں بہادر شاہ ابن مظفر شاہ گجراتی حکمراں تھا۔ پرتگالیوں کی یورش پر کالی کٹ کے راجا زمورن، علی عادل شاہ بیجاپور اور بہادر شاہ گجراتی نے مصر اور ترکی کے بادشاہوں سے مدد طلب کی۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ یہ تمام طاقتیں مل کر متحدہ محاذ بنا کر پرتگالیوں کو سمندر سے نکال باہر کریں۔ مصر و ترکی دونوں نے مدد کی۔ ایک بار مصر نے فوج بھیجی مگر پرتگال جنگ میں غالب رہا دوبارہ ترکی نے فوج بھیجی مگر جنگ میں کسی نتیجہ پر پہونچنے سے پہلے ہی ترکی فوج واپس چلی گئی۔ اس طرح

---

[1] مولانا سید سلیمان ندویؒ: عربوں کی جہاز رانی، باب واسکو ڈی گاما کا عرب رہنما۔ ص ۱۱۳

کوئی متحدہ محاذ نہ بن سکا اور ایک طاقت کے بس کی بات نہ تھی کہ وہ انفرادی طور پر پرتگالی بحری قوت کو شکست دے سکے جو افریقہ، ایشیا اور یورپ تین براعظموں میں پھیلی ہوئی تھی اور جدید طرز کے اسلحوں سے لیس تھی۔ آخر میں شاہ مصر نے ایک بڑی فوجی طاقت روانہ کی۔ مگر راستہ میں جدہ پہنچ کر مصر و ترکی میں باہم جنگ ہو گئی۔ مصر کو شکست ہوئی اور وہ ترکی کی زیر سیادت آگیا۔

چوتھے باب میں مصنف نے ان مساعی کا ذکر کیا ہے جو سلطان مصر قنصوہ غوری نے پرتگالیوں کے خلاف کی تھیں۔ زمورن، کالی کٹ کے راجا نے مسلمان بادشاہوں سے خط و کتابت کی کہ وہ آکر پرتگالیوں سے جنگ کریں۔ اس سلسلہ میں سلطان مصر قنصوہ غوری زمانہ حکومت (۹۰۶ھ تا ۹۲۲ھ) نے اس جانب توجہ کی اور امیر حسین کردی کو ہندوستان بھیجا۔ شیخ احمد زین الدین لکھتے ہیں کہ شروع میں امیر حسین کردی کو کامیابی حاصل ہوئی اور انہوں نے ۱۵۰۸ء میں جزیرۂ دیو پر حملہ کرکے اس کو فتح کر لیا۔ پرتگالیوں نے اس فتح کی اہمیت کا اندازہ کر کے ۱۷ بیڑوں سے امیر کردی پر حملہ کیا اور ۱۵۰۹ء میں ان کی طاقت ختم کر دی۔

تحفۃ المجاہدین کا ایک عیب یہ ہے کہ مصنف بڑے عظیم معرکوں کے ذکر میں صرف اشارات سے کام لیتا ہے مگر کیرالا میں جو مقامی جنگیں پرتگالیوں سے ہوئیں ان پر صفحات کے صفحات لکھتا ہے۔ استاذ سید طریحی نے اس موقع پر ایک طویل نوٹ لکھا ہے جس میں انہوں نے اس عظیم واقعہ کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کیا ہے اور علامہ سید سلیمان ندوی نے تو اس واقعہ کو سمندر میں اہل یورپ کے غلبہ کی فیصلہ کن جنگ قرار دیا ہے۔ ہوا یہ کہ جب حسین کردی سات بحری بیڑے لے کر آیا اور اس نے دیو پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا تو

پرتگالیوں نے ۱۷ بیڑے فراہم کر کے اس پر حملہ کیا جس کی وہ تاب نہ لا سکا اور ۹۱۴ھ میں وہ مصر واپس چلا گیا۔ اس کا صدمہ قنصوہ غوری کو بہت زیادہ ہوا۔ سلطان نے ایک عظیم متحدہ حملہ کا منصوبہ بنایا تاکہ پرتگالی قوت بحر عرب سے ختم ہو جائے چنانچہ اس نے رجب ۹۲۱ھ میں ۲۰ بحری بیڑے اور ۶ ہزار فوج روانہ کی مگر مسلمانوں کی بدقسمتی کہ اس مصری طاقت کا مقابلہ جدہ پہنچنے سے قبل ترکی فوج سے ہو گیا۔ مصر کو شکست ہوئی اور اس پر شاہ سلیم عثمانی کا قبضہ ہو گیا۔[1]

اس کتاب میں تین غیر معمولی اہم تاریخی واقعات کا ذکر مصنف نے کیا ہے۔ سلطانِ مصر کے حملہ کے بعد دوسرا اہم واقعہ جس کا ذکر مصنف نے کیا ہے وہ ہے گجرات پر ہمایوں کا حملہ۔ انہوں نے بتایا ہے کہ بہادر شاہ بن مظفر شاہ گجراتی نے ہمایوں کے حملہ سے بچنے کے لئے پرتگالیوں سے مدد طلب کی اور وہ اس کی مدد کے لئے آموجود ہوئے۔ وہ اگرچہ ہمایوں کے حملہ سے بچ گیا مگر نہ صرف بہادر شاہ بلکہ پورا ہندوستان یورپی طاقت کے جال میں پھنس گیا اس لئے کہ پرتگالیوں نے سب سے پہلے اپنی مدد کی قیمت وصول کی اور کئی بندرگاہوں پر ان کا قبضہ بہادر شاہ کی اجازت سے ہو گیا۔ بہادر شاہ نے ۵ بندرگاہیں ان کے حوالہ کر دیں لیکن انہوں نے جو سازش کی وہ نہایت خطرناک اور مکر و فریب سے پر تھی۔ انہوں نے بہادر شاہ کو دیو بلایا تاکہ وہ پرتگال کے گورنر سے مل کر خفیہ بات چیت کرے۔ یہ خفیہ ملاقات معاہدہ کی خاطر اور آئندہ حفاظت کے خیال سے بہادر شاہ نے منظور کر لی اور وہ گوا جانے کے لئے کشتی میں سوار ہو گئے مگر کچھ دیر بعد بادشاہ نے بھانپ لیا کہ پرتگالیوں کا ارادہ خطرناک ہے چنانچہ

---

[1] تحفۃ المجاہدین ص ۲۵۶

سی کشتی میں جنگ شروع ہوگئی جس کے نتیجہ میں بادشاہ قتل ہوکر سمندر میں گر گیا۔ اس واقعہ کا ذکر احمد زین الدین نے اس طرح کیا ہے :۔

"یہ اس طرح ہوا کہ اس سنہ کے آخر میں ہمایوں بن بابر نے اللہ دونوں کی قبروں کو منور کرے، دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد گجرات کا رخ کیا بعض شہر برباد کر ڈالے بہادر شاہؒ کو شکست ہوگئی۔ اس وقت اس نے پرتگالیوں سے ہمایوں کے ڈر سے مدد طلب کی وہ عجلت سے پہنچ گئے۔ دونوں طاقتوں میں عہد و صلح ہوئی۔ بہادر شاہ نے ان کو کئی بندرگاہیں عطا کیں جیسے دس، بھایم اور پرتگالیوں نے قریبی شہروں پر بھی قبضہ کرلیا اور آس پاس کی زمینوں پر۔ جس سے ان کو بڑا نفع پہونچا اور ان کا معاملہ بڑھ گیا۔ بہادر شاہ نے دیو بندرگاہ ان کو دے دی اور اس کو مضبوط کرنے کا حکم دیا اور اس بندرگاہ کے ٹیکس کا نصف حصہ اس نے پرتگالیوں کو دے دیا۔ جس سے انہوں نے بندرگاہ کو مضبوط کرلیا اور اسے قلعہ بنالیا۔ اس سے قبل انہوں نے مالک ایاس اور اس کی اولاد کے زمانہ میں کئی بار اس کا قصد کیا مگر کامیاب نہ ہوسکے اور انہیں ناکام لوٹنا پڑا۔ مگر جب خدا کا فیصلہ ان کے ساتھ ہوگیا تو اس نے یہ معاملہ ان پر آسان کردیا پھر خدا کی طرف سے یہ بھی مقدر تھا کہ بہادر شاہ ان کے ہاتھوں قتل ہوجائے اور اس کا جسم سمندر کی نذر ہوجائے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ اللہ کی طرف سے جو مقدر تھا سو ہوا۔ بہادر شاہ کا قتل ۳ رمضان ۹۴۳ھ میں عمل میں آیا۔ جب بہادر شاہ شہید ہوگئے تو پرتگالیوں نے پورے دیو پر قبضہ کرلیا۔ (اس لئے کہ بادشاہ نے صرف نصف ٹیکس کا حق ان کو دیا تھا) اور اب وہ اس کے مالک بن بیٹھے۔ یہ

خدا کی قدرت اور فیصلہ تھا جس کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔[1]

مصنف ان حوادث کا جو زیادہ اہم ہیں معمولی انداز میں ذکر کردیتے ہیں جیسا کہ مذکورہ بالا واقعہ سے ظاہر ہے مگر مالابار کے اندر جو واقعات پیش آئے ان کا ذکر بڑی تفصیل سے کرتے ہیں اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ دیو اور گوا میں پیش آنے والی جنگیں مالابار سے بہت دور ہوئی تھیں لیکن قتل و غارت اور جنگ و جدال کے جو واقعات مالابار میں پیش آئے وہ خود مصنف کے وطن کے ہیں جن میں اگر وہ شریک نہ بھی رہا ہو تو واقفیت کے بہت سے وسائل اس کو حاصل رہے ہوں گے اسی بنا پر اس کتاب میں تاریخ دار شاہ زمورن اور مسلمانوں کی متحدہ طاقت سے پرتگالیوں کے مقابلے میں جو واقعات پیش آئے ان کی داستان نہایت مفصل انداز سے اس کتاب کی زینت ہے۔ اس ساتویں باب کے آخر میں "علی ابراہیم مرکار" کا ذکر انہوں نے کیا ہے۔ جس کو یہاں پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ناظرین کو مصنف کے اندازِ بیان سے واقفیت ہوجائے۔ پوری کتاب میں انہوں نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ کشتیوں کی تعداد بیان کی ہے، جو لوگ جنگ میں شہید ہوئے ہیں ان کے نام، اگر وہ معروف لوگ ہیں تو اس کی بھی انہوں نے صراحت کردی، جنگ کی تاریخ بھی سنہ ہجری میں بیان کردی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :۔

"۹۷۳ھ میں پرتگالی پردلوز میں آئے اور انہوں نے کت ابراہیم مرکار کو قتل کیا جو علی ابراہیم مرکار کے ابن عم تھے اور دوسرے لوگ بھی قتل ہوئے پھر ان کی لاشوں کو جلادیا۔ پھر واپس چلے گئے۔ اگرچہ تانور کے راجا سے پرتگالیوں

[1] تحفۃ المجاہدین ص ۲۷۴ تا ۲۷۶

کا معاہدہ صلح تھا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ تانور اور پرولور والے پرتگالیوں کے
لائسنس لے کر کالی مرچ اور ادرک جدّہ لے جاتے تھے لیکن ابراہیم مرکار نے
ان کی اجازت کے بغیر کالی مرچ اور ادرک لے کر جدّہ کا سفر کیا (لہٰذا اس کو
پرتگالیوں نے مار ڈالا) اس واقعہ کی وجہ سے زمورن شاہ کالی کٹ پرتگالیوں اور
راجا کوچین سے لڑنے کے لئے نکلا۔ لڑائی کئی دن جاری رہی پھر اللہ نے زمورن کے
دل میں ان کی ہیبت ڈال دی لہٰذا وہ بغیر نیل مرام واپس آگیا پھر پرتگالیوں نے
کدنگالور میں قلعہ بنایا اور قلعہ زمورن کے لئے زبردست رکاوٹ ثابت ہوا۔
پھر علی ابراہیم مرکار و فقیہہ احمد مرکار اور ان کے بھائی علی مرکار رحمہم اللہ ۲۴
کشتیوں میں "قائل" کی طرف نکلے۔ پھر جب وہ بتیالہ پہنچے تو وہاں اترے اور
اپنی کشتیاں چھوڑ دیں اور کئی دن وہاں ٹھہرے رہے۔ پرتگالیوں پر کچھ کشتیوں
میں بیٹھ کر انہوں نے حملہ کیا اور ان کی تمام کشتیاں خدا کے حکم و قدرت سے چھین
لیں جو شہید ہوا سو شہید ہوا۔ یہ کشتیاں سنہ ۹۱۴ھ میں چھینی گئیں۔ باقی لوگ
بتیالہ سے مالابار واپس آگئے۔ جب وہ "کلانیط" پہونچے تو راستہ میں علی ابراہیم
مرکار رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوگیا۔ اسی سال نصف شوال میں پرتگالیوں نے۔ خدا
ان کو غارت کرے۔ کاپکات والوں کی کشتیاں چھین لیں جو کینانور شہر کے مقابل
میں تھے[1]۔"

مصنف نے اسی طریقہ سے تمام جنگوں کے حالات درج کئے ہیں۔ اس نے بیان
کیا ہے کہ پرتگالیوں اور زمورن شاہ کالی کٹ کے درمیان پانچ بار صلح ہوئی۔ ہر بار پرتگالی

[1] تحفۃ المجاہدین ص ۷۶، ۷۷

صلح کو اپنی خود غرضی سے توڑ دیتے تھے۔ اسی بنا پر اس نے ۵ ابواب صلح کی تفصیلات پر
لکھے ہیں جن کا بیان باعثِ تطویل ہے اس لئے قلم انداز کیا جاتا ہے۔

اس ساتویں باب میں جس کی عبارت میں نے اوپر نقل کی ہے مصنف نے بہادر
شاہ گجراتی کا اجمالی ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد کئی بادشاہ سریر آرائے سلطنت ہوئے
مگر ان میں سے کوئی اتنی طاقت حاصل نہ کر سکا کہ پرتگالیوں کا خاتمہ کر سکے۔ بہر حال
بہادر شاہ کے اس قتل کے بعد پرتگالیوں اور حکومت گجرات میں عداوت پیدا ہوگئی۔ یہ
صورت حال جاری تھی کہ اکبر نے گجرات پر حملہ کر کے وہاں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

یہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغل بادشاہوں نے پرتگال سے خوشگوار تعلقات
رکھے۔ ان کے پاس سمندری طاقت نہ تھی۔ وہ صرف سورت سے سمندری سفر کرتے
تھے اور پرتگال سے ان کا معاہدہ تھا۔ مگر یہ معاہدہ کیا تھا وہ سمندر میں پرتگال کے
ماتحت تھے۔ سورت کی بندرگاہ مغلوں کے پاس تھی۔ حجاج پرتگالیوں کے رحم و کرم پر
تھے وہ ان کو لوٹ لیتے تھے ان کو قتل کر دیتے تھے۔ اسیر کر لیتے تھے۔ اسلام کی توہین کرتے
تھے۔ مغل حکومت بے دست و پا تھی۔ یہاں تک کہ بعض علماء نے فتویٰ تک دے دیا کہ
اس بے یقینی کی حالت میں حج کرنا جائز نہیں یا یہ فریضہ پرتگالیوں کے ظلم کے باعث معطل
ہے، تعجب کا مقام ہے کہ اتنی زبردست مغل حکومت پرتگال کے ہاتھوں بے دست و پا
تھی اور ان سے تعلقات ہر حال میں ٹھیک رکھنا چاہتی تھی۔ اگر مغل گجرات کو فتح
کرنے کے بعد یہ طے کر لیتے کہ پرتگال کو گوا اور دیو سے نکالنا ہے تو یہ ان کے لئے
ناممکن نہ تھا۔ فرض کیجئے جس وقت سلطان قنصوہ غوری نے فوج بھیجی یا ترکی کے بیڑے
آئے اس وقت اگر مغل بھی اندر سے حملہ کر دیتے تو پرتگال کی قوت پاش پاش ہوجاتی

اس لئے کہ دو طاقتوں کا مقابلہ اس کے لئے آسان نہ تھا مگر اصل مشکل یہی تھی کہ اس وقت جب تک کہ گجرات کی حکومت موجود تھی مغل وہاں نہیں جاسکتے تھے مگر جب اکبر نے قبضہ کر لیا اور گجرات کی خود مختار حکومت اکبر کی حکومت کا جزء بن گئی اس وقت بھی اس نے پرتگال سے چھیڑ چھاڑ مناسب نہیں سمجھی یا اس کو اندازہ ہوا کہ مغل پرتگال سے ٹکر نہیں لے سکتے۔

دراصل بہادر شاہ کی عطا کردہ بندرگاہوں سے پرتگال کی طاقت بہت بڑھ گئی۔ ایک طرف وہ کالی کٹ اور مالابار میں زمورن سے ٹکر لے رہے تھے مگر جب شکست کھاجاتے تو فوراً گوا فرار اختیار کرتے اور وہاں تیاری کرتے پھر واپس آکر پوری قوت سے حملے کرتے۔ کئی بار زمورن اور مسلمانوں نے مل کر پرتگالیوں کو ساحل مالابار پر شکست دی ہے مگر گجرات اور گوا کی بندرگاہوں کی وجہ سے ان کو کمک ہوجاتی تھی اور ان کی شکست فتح سے تبدیل ہوجاتی تھی۔ فرض کیجیے اگر مغلوں نے ممالکِ اسلامیہ سے مدد طلب کی ہوتی اور خود اندرونِ ملک سے حملہ کرتے تو پرتگالیوں کا ہندوستان میں ٹھہرنا بڑا مشکل تھا۔ مغل، حاجیوں کے ساتھ ظلم و زیادتی برداشت کرتے رہے مگر انہوں نے کبھی پرتگال کی بحری طاقت سے تعرض نہیں کیا۔

گوا پر پرتگالیوں نے کیسے قبضہ کیا؟ اس پر محمد سعید طریحی نے ایک بڑا عمدہ نوٹ لکھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ گوا عادل شاہی سلطنت کے زیرِ حکومت تھا۔ البوکیری (ALBUQUERQUE) ہندوستان میں پرتگال کا امیر البحر بنا ۱۵۰۹ء میں، وہ نہایت ظالم اور طاقت ور تھا۔ وہ مسلمانوں اور عربوں کی جان کا دشمن تھا۔ گوا پر اس نے دو سمندری ڈاکوؤں کے ذریعہ قبضہ کیا۔ عادل شاہ نے البوکیری کو نکال باہر کرنے

کے لئے ایک فوج بھیجی مگر البوکیری نے مقامی ہندوؤں کی مدد سے اس کو شکست دے دی۔ مقامی ہندو راجاؤں نے البوکیری سے معاہدے کر لئے اور دونوں نے مل کر مسلمانوں کے خلاف محاذ بنایا۔ پرتگالیوں نے ہندوؤں کو اسلحے اور گھوڑے فراہم کئے اور ہندو پرتگالیوں کی غذائی ضرورتیں پوری کرتے اور مقامی پیداوار سے ان کی مدد کرتے اس بنا پر البوکیری نے گوا کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ یہ مقام تجارت اور جنگ دونوں کے لئے مناسب تھا اس لئے غیر مسلموں کی مقامی آبادی ان کے ساتھ تھی مگر کالی کٹ کا معاملہ بالکل مختلف تھا وہاں ہندوؤں اور مسلمانوں نے متحد ہو کر راجا زمورن کی زیرِ قیادت البوکیری پر حملہ کیا اور اس کو شکست فاش دی اور وہ زخمی ہوگیا۔ اور گوا واپس چلا گیا۔

گوا میں پرتگالیوں نے مقامی عورتوں سے شادیاں کیں اور نئے پرتگالی پرتگال سے لاکر بسائے تاکہ ایسی نسل پیدا ہو جو ان کے لئے مددگار ثابت ہو مگر گوا میں جو چیز سب سے زیادہ پھیلی وہ فحاشی اور جنسی عریانی تھی جس کی مثال کہیں اور ملنی مشکل تھی[1]۔"

تیسرا اہم واقعہ جو مصنف تحفۃ المجاہدین نے بیان کیا ہے وہ سلیمان پاشا وزیر سلیمان قانونی خلیفہ ترکی کا حملہ ہے۔ اس حملہ کا ذکر مصنف نے آٹھویں باب میں کیا ہے کہ ترکی خلیفہ کا وزیر سلیمان پاشا پوری تیاری اور طاقت سے نکلا۔ سب سے پہلے اس نے عدن کے امیر کو قتل کیا اور پھر اس پر قبضہ کیا اس کے بعد وہ "گوا" پہنچا۔ اور اس نے پرتگالیوں پر حملے کیے اور ان کے قلعوں کو توڑ پھوڑ ڈالا۔ ابھی جنگ

---

[1] مقدمہ کتاب تحفۃ المجاہدین از محمد سعید طریحی ص ۱۷۲-۱۷۳

جاری تھی کہ اس پر پرتگالیوں کی بحری طاقت کا خوف طاری ہوگیا اور اس نے "گوا" سے بغیر کسی نتیجہ کے کوچ کر دیا۔ یہ حیرت اور بڑے افسوس کی بات ہے کہ خلیفہ وقت کی عظیم طاقت بھی پرتگالیوں کو شکست نہ دے سکی۔ شیخ احمد زین الدین اس سلسلہ میں کتاب کے نویں باب میں سلطان سلیمان قانونی خلیفۂ ترکی کے وزیر سلیمان پاشا کے حملہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اس سنہ ۹۴۴ھ میں سلیمان پاشا جو سلیمان قانونی کے وزیر تھے جن کا ذکر آچکا ہے۔ وہ بڑی مکمل تیاری کے ساتھ.. اکشتیوں (مختلف طرز کی) وغیرہ کے ساتھ بندر عدن پہونچا اور اس کے بادشاہ عامر بن داؤد کو قتل کر دیا اور وہاں کے اعیان کو بھی۔ اور اس پر قبضہ کر لیا پھر جزیروں کی طرف گیا۔ اور پہلے دیو پر حملہ کیا اور سلطانی توپوں سے اکثر قلعے مسمار کر ڈالے۔ اس کے بعد اللہ نے سلیمان کے دل میں پرتگالیوں کی ہیبت ڈال دی لہٰذا بغیر فتح حاصل کئے وہ مصر لوٹ گیا پھر وہاں سے روم (ترکی) چلا گیا اور وہی ہوا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے امتحان کے لیے پہلے سے مقدر کر رکھا تھا۔"[1]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ احمد زین الدین سے اس سلسلہ میں تسامح ہوگیا ہے معاملہ یہ نہیں ہے جیسا کہ کتاب کے محقق اور مدون محمد سعید طریحی نے نیچے اپنے عالمانہ نوٹ میں بیان کیا ہے کہ مورخ اسماعیل سرہنگ نے اپنی کتاب حقائق الاخبار عن دول البحار جلد دوم صفحہ ۳۸ میں سنہ ۹۴۴ھ کے حوادث کے ذکر میں لکھا ہے کہ سلطان بہادر شاہ گجراتی نے سلطان سلیمان قانونی سے مدد مانگی۔ سلطان نے ایک اسطول

---

[1] تحفۃ المجاہدین فی احوال برتغالیین طبع ۱۹۸۵ بیروت ص ۲۸۷-۲۸۸

روانہ کر دیا جس میں ۶۰ بڑی کشتیاں اور ۳۰ عام کشتیاں تھیں ان کو توپوں اور دوسرے سامانِ جنگ سے لیس کر دیا تھا۔ وہ عدن آئے وہاں کے امیر عامر بن داؤد کو قتل کیا اور چند اصحاب کو بھی، پھر ایک شخص بہرام کو حاکم بنا کر وہاں فوج اور اسلحہ چھوڑ کر سلیمان باشاہ ہندوستان آئے۔ دیو بندر پر حملہ کیا۔ اس حملہ میں پرتگالیوں کو کامیابی ہوئی۔ اگرچہ سلیمان باشا نے بڑی جان توڑ کوشش کی مگر پرتگالیوں کو نکال نہ سکے لہٰذا شکست کے حالات کا اندازہ کر کے پہلے وہ عدن آئے وہاں بہرام کی جگہ مصطفیٰ کو حاکم بنایا اور پھر مصر واپس گئے۔[1]

اس طرح سلیمان قانونی کے وزیر کا حملہ ناکامی پر ختم ہوا ایک دوسرے مصنف نے اور وضاحت سے لکھا ہے کہ سلیمان کو شکست فاش ہوئی اس کے چار سو آدمی مارے گئے اور جب اس نے دیکھا کہ پرتگالیوں کو مزید کمک پہنچ گئی ہے تو اپنی توپیں چھوڑ کر وہ بھاگ گیا اور دیو سے کوچین آیا اور کوچین سے عدن۔ مگر سلطان قانونی کے لئے یہ جنگی مہم کامیابی کی تھی اس لئے اس کا قبضہ عدن پر ہوگیا۔ سلیمان پاشا وزیر اپنے ساتھ بہت سے ہندوستانی اور پرتگالی قیدی بھی لایا تھا جن کو قتل کر کے ان کے سر خلیفہ سلیمان قانونی کو قسطنطنیہ بھیج دیا۔[2]

مسلمانوں کی بحری طاقت کی تاریخ میں تحفۃ المجاہدین ایک بنیادی مرجع ہے جس کی عظمت روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ مذکورہ تینوں اہم بحری حملوں کے علاوہ اس کتاب کی اہمیت معاشرتی اور سیاسی نوعیت کی بھی ہے۔ اب سب سے پہلے موجودہ

---

[1] تحفۃ المجاہدین ص ۲۷۹ [2] تحفۃ المجاہدین ص ۲۸۰۔ یہ بیان عبارت ہے لاگریو بر کی کتاب سے LA GROVIERE PORIA ET BARBEROUSE P.252-253

ہندوستانی معاشرہ کے پس منظر میں اس کتاب پر ایک نئے پہلو سے بحث کی جاتی ہے۔

تحفۃ المجاہدین ہندو مسلم اتحاد کی راہ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔
شاہ زمورن کا امیر البحر کنجالی مرکار تھا۔ زمورن شاہ کالی کٹ نے بار بار مسلمانوں
کو ساتھ لے کر ہندو نائر فوج اور مسلمان اور بادشاہ نے مل کر پرتگالیوں پر حملے کئے
اور بارہا ان کو شکست دی اور کبھی خود بھی شکست کھائی مگر جب وہ ادھر ہارتے تو
تو دیو چلے جاتے تھے۔ بادشاہ نے بار بار متحدہ حملے کئے اور مسلمانوں سے مل کر پرتگالیوں
سے جنگ کی۔ اس پہلو سے اگر اس کتاب کے تمام واقعات کا مطالعہ کیا جائے کہ کس
طرح مسلمانوں اور ہندوؤں نے مل کر ایک غیر ملکی طاقت سے بحر عرب میں بار بار جنگ کی ہے
تو اس وقت یہ امر واضح ہو جائے گا کہ دراصل یہ دونوں جماعتیں اپنے ملک کے لئے
وفادار ہیں اور غیر ملکیوں کو نکالنے کے لئے دامے درمے قدمے سخنے ہر طرح سے جنگ
میں مصروف تھیں۔ چنانچہ شاہ زمورن نے مسلمان بادشاہوں کو بار بار خطوط لکھ کر
وہ آکر ان پرتگالیوں کو یہاں سے نکالیں۔

اس پہلو کے علاوہ اس کتاب کا دوسرا پہلو بھی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔
مخدوم احمد زین الدین نے اس کتاب کے آغاز میں علاقہ مالابار کے ہندوؤں پر سماجی
و معاشرتی نقطۂ نظر سے تبصرہ کیا ہے اور ان کے رسم و رواج اور انکی عادتوں کا جائزہ
لیا ہے۔ شیخ کی بیان کردہ بہت سی رسموں میں سے یہاں چند اہم رسموں کا ذکر کیا جاتا
ہے تاکہ اس کتاب کی تاریخی و سماجی اہمیت کا اندازہ ہو سکے۔

اگر برہمن یا نائر وغیرہ کا قریبی عزیز مر جاتا ہے تو یہ لوگ اپنا سر منڈا ڈالتے ہیں،
ناخون نہیں کاٹتے، عورتوں سے مخالطت نہیں کرتے اور ایک سال تک غم مناتے

ہیں۔ اور تصور کرتے ہیں کہ اس طرح مردہ سے وہ وفاداری اور قربت حاصل کر رہے ہیں۔
نائر ذات میں وراثت ماں کی طرف سے چلتی ہے، لڑکے جائیداد کے مالک نہیں
ہوتے بلکہ جائیداد لڑکیوں میں بٹ جاتی ہے۔ لڑکے کو اس کی بیوی سے وراثت ملتی
ہے یعنی وہ اپنی ساس کا وارث ہوتا ہے بلکہ اس کی بیوی اپنی ماں کی وارث بنتی ہے اس طرح
لڑکوں کو جائیداد نہیں ملتی۔ لڑکا لڑکی کے گھر جاکر رہتا ہے، لڑکی والے جائیداد اور گھر اس کو
دیتے ہیں اور یہ رسم آج بھی قائم ہے۔ کنیانور اور اس کے اطراف میں خود مسلمانوں میں
بھی یہی رسم ہے۔ شیخ زین الدین فرماتے ہیں کہ اس علاقہ کے مسلمان قرآن مجید پڑھتے
ہیں، عبادت کرتے ہیں، صاحب علم بھی ان میں ہیں مگر قدیم رواج اسی طرح قائم ہے
اور اسلام کی بتائی ہوئی وراثت کو چھوڑ کر رسمی طریقہ کو اختیار کرتے ہیں۔ لڑکا لڑکی کے
گھر چلا جاتا ہے اور ان کی اپنی جائیداد لڑکیوں کو مل جاتی ہے۔ عام پیشہ ور اپنی جائیداد
لڑکوں کو دیتے ہیں۔ لیکن برہمنی ذات میں یہ طریقہ بالکل مختلف ہے۔ ان کے یہاں
شادی صرف سب سے بڑا لڑکا کرتا ہے۔ اگر اس کے اولاد نہ ہوئی تو دوسری شادی
کرلیتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ بہت سے ورثا نہ پیدا ہوں اور جھگڑے نہ بڑھیں۔
لہٰذا بڑا لڑکا تو شادی کرتا ہے اور باقی بھائی نائر کی عورتوں سے تعلق پیدا کر لیتے
ہیں بغیر شادی کے۔ یہ طریقہ معروف ہے اور ایسا اجازت سے ہوتا ہے، برہمن
کے تعلق کو نائر برا تصور نہیں کرتے حالانکہ اس عورت کا اپنا نائر شوہر بھی ہوتا ہے۔

نائر ذات میں ایک رواج اور ہے۔ ایک عورت کے دو سے چار بلکہ گیارہ
تک شوہر ہوتے ہیں اور جس طرح مسلمانوں میں عورتوں کے درمیان راتوں کو تقسیم
کرنے کا طریقہ ہے، اسی طرح ان کے یہاں شوہروں میں راتیں تقسیم ہو جاتی ہیں۔

ہر شوہر اپنی رات کو آتا ہے۔ اس طریقہ میں کبھی جنگ وجدال واقع نہیں ہوتی۔ نجار، حدّاد اور دوسرے پیشے والے بھی ایسا کرتے ہیں۔

دسویں صدی ہجری میں یہ رواج رہا ہوگا مگر اب حالات کے تغیر نے اس کو بدل ڈالا ہے، لیکن یہ رواج ابھی تک نائروں میں باقی ہے کہ باپ کی جائیداد لڑکیوں کو ملتی ہے اور لڑکے جائیداد اپنی سسرال میں پاتے ہیں۔ عام مسلمانوں میں یہ رواج نہیں، مگر کولینڈی اور کنیانور کے علاقہ میں یہ رسم مسلمانوں میں بھی جاری ہے بلکہ خاندانی نام بھی عورت کی جانب سے چلتا ہے۔ باپ کا نام لڑکے اپنے نام کے ساتھ نہیں لکھتے اس لئے کہ ان علاقوں میں ہر شخص کا اپنا خاندانی نام بھی ہوتا ہے جو ملایالم زبان سے مستعار ہوتا ہے۔ عربی نام کے ساتھ ملایالم نام کا ہونا ضروری تصور کیا جاتا ہے۔

شیخ احمد زین الدین نے چھوت چھات کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہاں اسلام کی اشاعت کا ایک سبب بن گیا۔ اگر کوئی اونچی ذات والا کسی نیچی ذات والے کو چھو لے یا اس سے جنسی تعلقات پیدا کرنے تو اس کے لئے صرف تین طریقے ہیں، یا تو اسے غلام بنا کر فروخت کر دیا جائے یا وہ مسلمان یا عیسائی بن جائے۔ چنانچہ اسلام کے پھیلنے کا ایک سبب یہ بھی اس علاقہ میں رہا ہے۔

حسرت کی سیاسی شاعری

از

جناب نسرین ممتاز بصیر صاحبہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

حسرت کے سیاسی اشعار کے تجزیہ سے ان کی حریت پسندی، آزادی خیال اور حب الوطنی میں شدت و انتہا پسندی کا پوری طرح اندازہ ہوتا ہے اور ان میں ہندوستان اور بیرون ہند کے حالات اور واقعات کی گونج بھی صاف سنائی دیتی ہے انھوں نے غلامی کی لعنت، فرنگیوں کے جبر و استبداد، سماج کی طبقاتی تقسیم، سودیشی تحریک، آزادی کامل، اشتراکیت اور کمیونزم وغیرہ کا جس طرح ذکر کیا ہے اس سے حسرت کے افکار و نظریات اور عملی سرگرمیوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اس کے علاوہ ان کے دور کی اہم اور مشہور شخصیتوں کے خط و خال بھی کسی حد تک نمایاں ہوتے ہیں۔

ملک کی جنگِ آزادی میں حسرت نے تن، من، دھن کی بازی لگادی تھی اور ان کی شاعری میں بھی آزادی و حریت کا جذبہ کامل اپنی حد انتہا کو پہنچ گیا تھا بقول پروفیسر مجنوں گورکھپوری:-

"واقعہ ہے کہ حسرت اور ان کی شاعری کو ملک کی تاریخی قوتوں اور تحریکوں سے الگ کرکے پیش نہیں کیا جاسکتا[1]"۔

حسرت کے سیاسی افکار و رجحانات سرزمین علی گڈھ میں نمو پذیر ہوئے اور ان میں بتدریج اتنی تندی اور حرارت پیدا ہوئی کہ انگریزوں کے سایہ سے بھی انھیں

---

[1] پروفیسر مجنوں گورکھپوری، حسرت کی غزل، نگار حسرت نمبر جنوری، فروری ۱۹۵۲ء

نفرت ہو گئی اور مکمل آزادی کا نعرہ سب سے پہلے بلند کرنے کا سہرا انہیں کے سر
باندھا جاتا ہے۔

حدیث کامل کی قسم کھا کے اٹھے ہیں — اب سایۂ برٹش کی طرف جائیں گے کیا ہم

وہ ایک ایسے پروانے تھے جن کا کاشانۂ دل ملک کے پیار کی شمع سے ہمیشہ منور رہا۔

کیوں نہ ہوں تیری محبت سے منور جان و دل — شمع جب روشن ہوئی گھر میں اجالا ہو گیا

انہوں نے سرفروشی کی شمع کو ہر حال میں فروزاں رکھا اور طعن و طنز کی پروا کئے بغیر
ہر دشواری اور مشکل کو ہنستے کھیلتے جھیل لے گئے۔

طعن احباب سے سرزنش خلق سہی — ہم نے کیا کیا تیری خاطر گوارا نہ کیا

یہ ملک اور قوم سے والہانہ عشق ہی تو تھا جس نے انہیں ہر حال میں فرنگیوں کے جور و
ستم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے پر کمربستہ رکھا۔ ع

ہم قول کے صادق ہیں اگر جان بھی جاتی

وہ محکوم، مغلوب اور مظلوم ہندوستانی قوم کو اس کا جائز مقام اور حق دلانے کے لئے
کوشاں و سرگرداں رہے اور بار بار اپنے ہم وطنوں کو یاس و حرماں کی فضا سے متاثر نہ ہونے
کی تلقین کرتے رہے، ظلم و ستم اور جبر و استحصال دیکھتے تو سراپا درد و غم بن جاتے اور ان
کے اشعار بھی صدائے درد اور نالۂ غم بن جاتے۔

ان کے اشعار میں جگہ جگہ اس امر کا اظہار ملتا ہے کہ ملک میں انقلاب رونما ہونے،
اپنا حق آزادی منوانے اور غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لئے عدم تشدد، نرم روی نیز غیر
کی جد و جہد پر تکیہ کرنے سے کام نہیں چلے گا۔

غیر کی جد و جہد پر تکیہ نہ کر کہ ہے گناہ — کوشش ذات خاص پر ناز کر اعتماد کر

اپنے ہم وطن بھائیوں پر ظلم و ستم کی سختیاں دیکھ کر وہ لرز جاتے انہیں اس
بات کا احساس تھا کہ ان کے ہم وطن اپنی پستی، زبوں حالی اور غلامی کی ذات سے بے خبر
خواب خرگوش میں مبتلا ہیں۔

رسم جفا کامیاب دیکھئے کب تک رہے — حب وطن مست خواب دیکھئے کب تک رہے

انگریزوں کے فریب کے سلسلۂ دراز پر انہیں قلق تھا کہ ان کے ہم وطنوں کے صبر و
ضبط اور تحمل کا امتحان لیا جا رہا ہے۔

تا کجا ہوں دراز سلسلہ ہائے فریب — ضبط کی لوگوں میں تاب دیکھئے کب تک رہے
پردۂ اصلاح میں کوشش تخریب کا — خلق خدا پر عذاب دیکھئے کب تک رہے

انقلاب کی آواز بلند کرنے والوں اور اپنے حقوق کے لئے جنگ کرنے والوں کو اپنی
منزل مقصود تک رسائی حاصل کرنے کے لئے جو مشکلات، پریشانیاں، الجھنیں اور صعوبتیں
برداشت کرنی پڑتی ہیں وہ نصب العین کی بلندی کے ساتھ بقدر ظرف و ذوق مضاعف
ہوتی جاتی ہیں اور لذت زخم و جگر کا سبب بنتی ہیں ویسے تو ہر جری اور بے باک لیڈر کے
اوصاف میں اس کا بلند ہمت، بے خوف اور نڈر ہونا شامل ہے مگر حسرت نے جس زمانہ اور
سیاسی فضا اور جن حالات میں نعرۂ آزادی بلند کیا تھا وہ بڑا سنگین و خطرناک دور تھا۔
ان کو اندازہ تھا کہ ردعمل کے طور پر ظلم و ستم شروع ہوگا لیکن اس کے باوجود اس صوفی منش
اور درویش صفت جنگ آزادی کے دیوانے نے شاہ جنوں سے خلعت آزادگی قبول
کرتے ہوئے فرنگیوں کے جور و ستم کی ذرہ برابر پرواہ نہیں کی البتہ انہیں اس بات کا
خوف ضرور رہا کرتا تھا کہ مصائب و آلام کے طوفان سے گھبرا کر اہل وطن کہیں ہمت
نہ ہار بیٹھیں:

اچھا ہے اہلِ جور کیے جائیں سختیاں — پھیلے گی یونہی شورشِ حب وطن تمام

اٹھے ہیں جفا پیشگانِ مہذب — ہمارے مٹانے کو تیار ہو کر

حسرت کی سیاسی زندگی اور سرگرمیوں میں انکے رسالہ اردوئے معلی[1] کو امتیازی حیثیت حاصل ہے جس میں ادبی ذوق وشعور کے ساتھ ہی اس دور کے سیاسی افکار کو بھی جا بجا جھلک دکھائی دیتی ہے اس میں حسرت کی حب الوطنی کے جذبات کی شعلہ فشانی اور تپش اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ علامہ شبلی نعمانی بھی اس کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکے[1]۔

اردوئے معلی میں شائع ہونے والے ایک مضمون "مصر میں انگریزوں کی حکمت عملی" کی بنا پر حسرت کو جو قید فرنگ نصیب ہوئی اس کی بھی ایک کہانی ہے[2]۔ ان کی آزاد پسند طبیعت اور حریت کامل کی لگن نے انہیں شروع شروع میں کانگریس کی جانب متوجہ کیا[3] لیکن جلد ہی ان کے بغاوت پسند مزاج نے کانگریس کو خیرباد کہا[4]۔ اس معاملہ میں وہ اپنی انتہاپسندی کی وجہ سے کسی جماعت سے بھی نباہ نہیں کر پاتے تھے کیونکہ ان کے حریت پسندانہ خیالات اور باغیانہ احساسات وجذبات کی تسکین کا مکمل سامان کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔

---

[1] علامہ سید سلیمان ندوی: کلیات حسرت، نعمانی پریس، ۱۹۷۰۔ [2] اردوئے معلی میں چھپے اس مضمون کے بارے میں مولانا سید سلیمان ندوی کا بیان ہے کہ اس کے مضمون نگار اقبال سہیل تھے لیکن نواب محسن الملک اور دیگر گواہوں کے جلو میں حسرت نے خوشی خوشی یہ الزام اپنے سر لے لیا اور جیل جانا قبول کر لیا۔

[3] اس وقت یہی ایک جماعت تھی جو منظم طور پر تحریک آزادی کی جدوجہد میں حصہ لے رہی تھی۔

[4] کانگریس میں شامل چند رہنماؤں کے رویے سے تنگ آکر انہوں نے ۱۹۰۷ء میں کانگریس سے استعفا دیدیا۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی بےخوف، بےباک اور جری طبیعت کسی بھی طاقت، بیرونی دباؤ اور مصلحت کے سامنے نہیں جھکتی تھی بلکہ وہ آزادی اور بےباکی کے ساتھ اپنا کام کرتے رہتے تھے ان کا خیال تھا کہ ہر وہ جنگ جو صداقت اور سچائی کے لئے لڑی جاتی ہے وہ بےخوف وخطر اور ببانگِ دہل لڑی جاتی ہے اور ہر وہ قدم جو حق اور آزادی کے لئے اٹھتا ہے وہ سبک خرامی سے نہیں بلکہ زمین کے سینہ میں لرزش پیدا کرتا ہوا اٹھتا ہے جہاں فریق مخالف ظلم وستم پر آمادہ ہو وہاں مصلحت اور نرم روی سے کام نہیں چلتا جہاں حق تلفی کا بازار گرم ہو وہاں خوش خلقی اور مروت کے کیا معنی؟ صبر وتحمل کے کاسۂ گدائی سے بھلا حکومت واپس ملا کرتی ہے؟ حسرت کے انہیں جذبات کا سیل رواں ان کے صبر وضبط کی طاقت کو بھی بہالے جاتا تھا اور آزادی کی تڑپ ان کی شرر انگیز تحریروں اور شعلہ بار تقریروں میں نمایاں ہو جاتی تھی، حد تو یہ ہے کہ وہ اعتدال پسندوں کی صف میں بھی کھڑے ہونا گوارا نہ کرتے[1]۔ پروفیسر مجنوں گورکھپوری نے لکھا ہے:

"حسرت کا سیاسی مسلک دراصل کانگریسی اور مسلم لیگ دونوں سے الگ تھا وہ خود ہندوستان کی سیاسی جماعت کے گرم سے گرم فرقے سے بھی زیادہ گرم تھے۔ وہ صحیح معنوں میں باغی تھے اور اس وقت تک بغاوت کرتے رہنا ان کا ایمان تھا جب تک ملک میں ایسا فطری نظام قائم نہ ہو جائے جو انسانی ناموس کی صیانت کے لئے لازمی ہو اور جس سے سارے بندگانِ خدا کی فلاح ہو سکے[2]۔"

اپنی اسی جرأت اور مستحکم رائے اور انگریزوں کے خلاف انتہاپسندانہ خیالات ونظریات کے باعث اور اعتدال پسند لوگوں سے دل برداشتہ بھی ہو جایا کرتے

---

[1] سنہ ۱۹۰۶ء میں کانگریس کے سورت اجلاس اور بعض دوسرے موقعوں پر حسرت نے اس کا عملی ثبوت بھی دیا۔

[2] مجنوں گورکھپوری، رسالہ اردو علی گڑھ۔ حسرت نمبر ۱۹۵۱ء "حسرت موہانی ص ۸۵"

تھے۔ وہ لوگ جو مصلحت پسندی کے باعث انگریزوں کی پالیسی پر خاموشی اختیار کر جاتے انہیں اکثر و بیشتر حسرت کے لفظی عتاب کا بھی شکار ہونا پڑتا تھا۔ اس سلسلے میں وہ مسٹر جناح، پنڈت نہرو اور مہاتما گاندھی تک پر نکتہ چینی کرنے سے نہیں ہچکچاتے تھے اس رویہ کے باوجود یہ تمام رہنما حسرت کی حب الوطنی ایثار و قربانی، جذبہ خلوص اور صداقت کی قدر کرتے اور ان کی تلخ باتیں بھی برداشت کر جاتے۔

حسرت نے مصلحت پسندی صلح و عدم تشدد کے خلاف جو کچھ لکھا ہے ان میں طنز کی نشتریت کو بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مصلحت وقت کی خاطر حق سے گریز کرنے والوں کو وہ پیشوا اور رہنما ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے ان کے نظریہ کے مطابق عقدۂ جنگ کا حل صلح و نرمی نہیں:

حق سے بعذر مصلحت، وقت پر جو کرے گریز ان کو نہ پیشوا سمجھ اس پہ نہ اعتبار کر

کچھ صلح و نرمی سے رہ جائے دیکھو نہ یہ عقدہ جنگ دشوار ہو کر

گاندھی جی کی طرح بیٹھ کر کیوں کاتیں گے چرخہ لینن کی طرح دیں گے نہ دنیا کو ہلا ہم

جسے کہتے ہیں اہنسا ایک اصول خودکشی تھا عمل اس پر کوئی کرتا نہ کبھی عوام کرتے

"تجویز رفارم مانٹیگو" پر حسرت چیں بہ جبیں ہو کر "بے رنگ و خوشبو کاغذ کے پھولوں" کی پھبتی کستے ہیں۔

مشہور زمانہ ہیں مسلم دستور کے حسب ذیل پہلو
قانون پہ اختیار کامل عمال پر زور، زیر قابو
ان میں سے نہ ہو جب ایک کی بھی گلہائے رفارم میں کہیں بو
کاغذ کے بجھے پھول ان کو جن میں نہ ہو نام کو بھی خوشبو

مقصود یہ ہے کہ صرف تا جنگ ہم سب ہیں صرف ایں تگاپو
کس درجہ فریب سے مملو تجویز رفارم مانٹیگو

دوسری طرف اپنے ہم مشرب اور بلند مرتبت رہنماؤں کی تعریف قدر دانی اور حوصلہ افزائی ببانگ دہل اور کھلے دل سے کرنا حسرت کی وسیع القلبی اور اعلیٰ ظرفی کا بین ثبوت ہے۔ حصول آزادی کے لئے اپنا مسلک بغاوت رکھنے والے حسرت لالہ لاجپت رائے، اربند گھوش اور خاص طور پر بال گنگا دھر تلک کے "گرم رویے" اور ان کی انتہا پسندی کے گرویدہ ہو گئے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ملک و قوم کے لئے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی تھیں۔ جوش ہیں وہ تلک کو اپنا گرو تصور کر کے ان کی پیروی پر ناز کرتے اور انہیں حق پسند، حق شناس اور حق بیں کا خطاب دیتے۔

اے تلک اے افتخار جذبۂ حب وطن حق شناس و حق پسند و یقین و حق سخن
تجھ سے قائم ہے بنا آزادیٔ بیباک کی تجھ سے روشن ہے اہل اخلاص وفا کی انجمن

تو نے خودداری کا پھونکا اے تلک ایسا فسوں یک قلم جس سے خوشامد کی مٹی رسم کہن
ناز تیری پیروی پر حسرت آزاد کو اے تجھے قائم رکھے تا دیر رب ذوالمنن

تلک کے انتقال پر حسرت ان الفاظ میں ماتم کناں ہیں

ماتم نہ ہو کیوں بھارت میں بپا دنیا سے سدھارے آج تلک
بلونت تلک، مہاراج تلک، آزادوں کے سرتاج تلک

مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد کے خیالات و جذبات کا اعتراف کرتے ہوئے مولانا حسرت نے فرمایا

ہم پیرس دل ہی سے مخصوص نہیں لذت غم خوش اس حال میں جوہر بھی ہیں آزاد بھی

حسرت کے قلندرانہ مزاج نے انہیں ہر حال میں خوش رہنے کا سبق سکھایا اسی لئے قید فرنگ میں "چکی کی مشقت" کے ساتھ ہی انہوں نے "مشق سخن" کو بھی جاری رکھا اور ان تلخ کیفیتوں کو بھی بڑی حد تک اشعار میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ ان کی سات سو اکہتر (۷۷۱) غزلوں میں سے تین سو تہتر (۳۷۳) قید اور نظر بندی کی حالت میں لکھی گئی ہیں۔ ان کے مطالعے سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ حسرت نے اس قید کو بھی اپنی قلندرانہ شان کا حصہ بنا دیا تھا۔

جس وقت پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی اور مسلمانوں میں شورش بپا ہوئی تو برطانوی حکومت نے مشکوک افراد کی فہرست مرتب کی اس میں مولانا حسرت کا بھی نام تھا ان پر منجملہ دیگر الزامات کے غیر ممالک سے تعلقات کا الزام بھی تھا جسے حسرت نے ماننے سے انکار کر دیا مگر انہیں فوری نظر بندی کا حکم دے کر للت پور جیل اور پھر جھانسی جیل میں بھیج دیا گیا لیکن جیل کی صعوبت اور تنہائی ان کے لئے گھبراہٹ، پریشانی اور مایوسی کا سبب نہیں بنی بلکہ ان کے اشعار میں رقصاں تبسم کی لہریں گراں کے قید و بند اور محن و تکالیف کا مداوا بن جاتیں۔

حسرت آئے گی تسلی کو یہاں مدح شمیم — قید ہو آئے ہیں جھانسی جو للت پور سے

درس حق جاری ہے یہاں حسرت آزاد کا — قید خانہ مدرسہ ہے گویا فیض آباد کا

بیکار ڈراتے ہیں مجھے قید ستم سے — واں روح وفا دہر بھی آزاد رہے گی

اچھا ہوا کہ خاطر حسرت سے مٹ گئی — ہیبت سی ایک جو خطرہ دار و رسن سے تھی

حسرت وطن کے جذبۂ عشق و محبت سے سرشار تھے اس لئے قید و بند کی صعوبتوں میں زندگی کے شب و روز گزارنے سے انہیں کیف و سرور حاصل ہوتا تھا۔ ظاہری نظر بندی میں باطن کی آزادی کو محسوس کر کے وہ جوش مسرت سے جھوم اٹھتے تھے اور دیدۂ دل کے وا

ہونے پر فخر کرتے تھے چنانچہ کہتے ہیں

شاہ جنوں نے خلعت آزادگی دیا — زنداں میں ہیں خیال کے صحرا بنے ہوئے

باطن میں ہیں آزاد بظاہر ہیں نظر بند — ہے دیدۂ دل باز یہاں دیدۂ سر بند

حسرت ایک صوفی منش، درویش صفت اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے، اسلام کے اصول مساوات ان کے لئے بہت پرکشش تھے، ان کی جھلک ان کو "سوویت آئین" میں بھی نظر آتی تھی۔ اسی لئے انہوں نے اس کا خیر مقدم کیا اور ہندوستان کی آزادی اور ترقی کے لئے اسے موزوں قرار دیا، ۱۹۲۵ء میں وہ کمیونزم کی جانب مائل ہو گئے۔ شروع میں نیشنلسٹ اور بعد میں خود کو "کمیونسٹ" کہنے لگے اور اپنے لئے اشتراکی مومن کی ترکیب استعمال کی۔ وہ اشتراکیت کے نظام کی قدر کرتے اور اسی طریقہ عمل کو ہندوستان میں رائج کرانا چاہتے تھے۔[1] وہ جمہوریت کے قائل اور سماج کی طبقہ وارانہ تقسیم کے مخالف تھے تاکہ قوت مزدور کا بہانگ دہل اعلان اور سرمایہ داروں کی نخوت کا اختتام ہو سکے اسی لئے ابتداً انہوں نے دیسی صنعتوں کو فروغ دینے کے لئے جدوجہد کی۔[2]

سوویت آپ کا مقصد، بغاوت آپ کا مسلک — مگر اس پر بھی حسرت کی غزل خوانی نہیں جاتی

[1] اس موضوع پر ان کے مضامین رسالہ اردوئے معلی میں اکثر شائع ہوتے تھے مثلاً مئی ۱۹۳۸ء اکتوبر دسمبر ۱۹۳۸ء وغیرہ اس رسالہ میں شائع ہونے والے مضامین میں سے چند کے عنوانات حسب ذیل ہیں۔

"روس میں نئی پود کی ترقی" "سوشلزم اور مسلمان" "سوشلزم کیا چاہتا ہے" "اسلام اور سوشلزم" "چینی مسلمان اور کمیونسٹ اقتدار" وغیرہ۔

[2] جب علی گڑھ میں انہوں نے سودیشی کپڑوں کی دکان کھولی تو علامہ شبلی نعمانی نے فرمایا۔

"پہلے شاعر تھے پھر پالیٹین ہوئے اور اب بنئے ہو گئے۔"

لازم ہے یہاں غلبۂ آئینِ سویت
وہ ایک برس میں ہو یا دس بیس برس میں

دستور کے اصول مسلّم ہٹ پ گئے
شاہی بھی رام غلبۂ مزدور ہو گئی

نہ سرمایہ داروں کی نخوت رہے گی
نہ حکام کا جور بے جا رہے گا

ان کی کلیات میں اشتراکیت پر ایک مسلسل نظم بھی ملتی ہے، حسرت اپنی شاعری میں اکثر اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اشتراکیت کی بدولت امن، صلح، آدمیت اور بھائی چارگی کی فضا قائم ہوتی ہے۔

مصیبت میں بہرسو رنگ فطرت ہے جہاں میں ہوں
اخوت ہے جہاں میں ہوں، سویت ہے جہاں میں ہوں

انہوں نے کمیونزم، سوشلزم اور جمہوریت پر نظموں کے علاوہ مضامین بھی لکھے ہیں، مگر مجنوں گورکھپوری کا خیال ہے کہ وہ اس نئے نظام فکر اور دستور العمل کا کوئی مفصل اور غائر مطالعہ نہیں کر سکے اسی لئے ان کے تعمیری لائحہ عمل میں نہ تو وضاحت ہے اور نہ ہی استقامت۔

اردو زبان میں اشتراکیت پر سب سے پہلے اتنی وضاحت کے ساتھ اظہار خیال کرنے اور آزادیٔ کامل کا نعرہ بلند کرنے والے مولانا حسرت کے سیاسی افکار کے متعلق جو جھلکیاں ان کے اشعار میں موجود ہیں وہ بڑی حد تک ان کے نظریات کی وضاحت کرتی ہیں۔ اگرچہ یہ کوئی مفصل اظہار یا باقاعدہ سیاسی لائحہ عمل نہیں ہے۔

دیوان بیدار میں شامل ایک غزل

از

ڈاکٹر نسیم احمد۔ کچھا بنارس یونیورسٹی

شاہ محمدی بیدار (متوفی ۱۲۱۰ھ/۱۷۹۶ء) کا شمار اٹھارہویں صدی کے مشاہیر اور صاحب طرز شعرائے ریختہ میں ہوتا ہے، اردو میں وہ خواجہ میر دردؔ اور فارسی میں مرتضیٰ قلی بیگ فراقؔ کے شاگرد تھے۔ اردو اور فارسی کے دو[2] الگ الگ دیوان ان سے یادگار ہیں۔ دیوان اردو دو مرتبہ زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آچکا ہے۔ اوّل محوی صدیقی کا مرتبہ دیوان بیدار مدراس یونیورسٹی نے ۱۹۳۵ء میں شائع کیا۔ اس کے تقریباً دو[2] برس بعد ۱۹۳۷ء میں جلیل احمد قدوائی کا ترتیب دیا ہوا "دیوان بیدار" ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد سے چھپ کر شائع ہوا۔ متذکرہ بالا دونوں ایڈیشن کم یاب ہو گئے ہیں۔ اور بازار میں نہیں ملتے البتہ ملک کی چند لائبریریوں اور بعض اہلِ ذوق حضرات کے ذاتی کتب خانوں میں ان کے نسخے محفوظ ہیں۔ اوّل الذکر دیوان کا ایک نسخہ سنٹرل لائبریری بنارس ہندو یونیورسٹی میں موجود ہے جو استاد محترم ڈاکٹر حنیف احمد نقوی شعبہ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی کے مطالعے میں بھی رہا ہے لیکن فی الوقت تلاش و تجسس کے باوجود، کتب خانے کی بدنظمی کے باعث یہ نسخہ مجھے دستیاب نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر صاحب نے نسخہ محوی کے علاوہ نسخہ قدوائی بھی دیکھا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق یہ دونوں ایڈیشن ایک دوسرے سے کافی مختلف ہیں۔ یہاں جملہ معترضہ کے طور پر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کلام بیدار کی ادبی و لسانی اہمیت، ان چھپے ہوئے ایڈیشنوں کی کم یابی نیز ان کے مندرجات کے باہمی فرق کے پیش نظر دیوان بیدار کے ایک مستند اور جامع ایڈیشن کی اشد ضرورت ہے اس کی تیاری میں مطبوعہ نسخوں کے علاوہ قلمی نسخوں اور تذکروں سے بھی مدد لی

جانی چاہئے۔

سردست ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی استاد شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی کے ذخیرۂ کتب میں موجود دیوان بیدار مرتبہ جلیل احمد قدوائی ہمارے پیش نظر ہے۔ اس کے مطالعے کے دوران تیئیس[۲۳] اشعار ایسے حصۂ غزلیات میں نظر آئے جو سوداؔ کے بعض قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں بھی جزوی یا کلی طور پر موجود ہیں۔ یہاں ان اشعار کے متعلق تفصیلات پیش کرنے سے قبل سطور ذیل میں انہیں "دیوان بیدار" مرتبہ جلیل احمد قدوائی کے مطابق مع اختلافاتِ دیوان سوداؔ (کلیات سودا جلد دوم مرتبہ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی، غزلیات مرزا محمد رفیع سوداؔ مرتبہ ڈاکٹر ناجرہ ولی الحق اور دیگر قلمی نسخوں کے مطابق نقل کیا جاتا ہے۔

دیوانِ بیدارؔ	دیوانِ سوداؔ
۱۔ ہم ہی تنہا نہ تری چشم کے بیمار ہوئے	۱۔ ہمیں تنہا..........
اس مرض میں تو کئی ہم سے گرفتار ہوئے	
۲۔ سینۂ خستہ ہمارے سے ہے غربال کو رشک	۲۔
ناوکِ غم جگر و دل سے زبس پار ہوئے	
۳۔ بکنے موتی لگے بازار میں کوڑی کوڑی	۳۔
یاد میں تیری بس چشم گہربار ہوئے	بسکہ تجھ بن مژۂ چشم
۴۔ روز اول کہ تم آمصرِ محبت کے بیچ	۴۔ ....
یوسف عصر[۱] ہوئے رونقِ بازار ہوئے	
۵۔ نقد جان و دل و دیں دے کے لیا ہم نے تمہیں	۵۔ .... دے کے لیا سودا نے

[۱] نسخۂ نوی میں مصر ہے۔ (معارف)

دیوانِ بیدارؔ	دیوانِ سوداؔ
سینکڑوں اہل ہوس گرچہ خریدار ہوئے	
۶۔ گھر میں لے آئے تمہیں[۱] چاہ سے کر کے شادی	۶۔ .... کرتے شادی
کہ تم اس غم کدہ میں شمع شب تار ہوئے	
۷۔ رخِ تاباں سے تمہارے[۲] کہ ہے خورشید مثال	۷۔
در و دیوار سبھی مطلع انوار ہوئے	
۸۔ ڈھونڈنے تم کو پڑے[۳] پھرتے تھے ہم شہر بہ شہر	۸۔ ڈھونڈتے تم کو صنم پھرتے تھے ....
خوار و رسوائے سر کوچہ و بازار ہوئے	
۹۔ للہ الحمد کہ مدت میں تم اے نورِ نگاہ	۹۔
باعث روشنی دیدۂ خونبار ہوئے	
۱۰۔ خانۂ چشم میں رکھتے تھے شب و روز کہ تم	۱۰۔ خانۂ چشم میں یاد رہتے تھے شب و روز کہ تم
قرۃ العین ہوئے راحتِ دیدار ہوئے	....
۱۱۔ دیکھ کر مہر و وفا و کرم و لطف کو ہم	۱۱۔ ... .
جانتے یوں تھے کہ تم یار وفادار ہوئے	.... یار وفادار ہوئے
۱۲۔ جس میں تم ہوئے خوشی سو ہی تو ہم کرتے تھے	۱۲۔
پر نہیں جانتے کس واسطے بیزار ہوئے	پھر نہیں جانتے ....
۱۳۔ اب ہمیں چھوڑ کے یوں زار و نزار و غمگیں[۳]	۱۳۔ .... غم ناک
تم کہیں اور ہی جا یاں سے نمودار ہوئے	.... جا یہاں[۴] سے

[۱] نسخۂ نوی میں "تجھے" ہے (معارف) [۲] نوی میں "ہے تم کو سجن! پھرتے تھے" ہے (معارف) [۳] نوی میں "غمناک" ہے (معارف) [۴] مطبوعہ نسخوں میں "یاں" ہے۔ مطبوعہ نوی میں "یہاں" ہی ہے۔

۱۴۔ یہ تو ہرگز ہی نہ تھی تم سے توقع ہم کو
کہ ستم گار[۱] دل آزار، جفاکار ہوئے

۱۵۔ نہ وہ اخلاص و محبت ہے نہ وہ مہر و وفا
شیوۂ جور و جفا و ستم اظہار ہوئے

۱۶۔ یاد وہ الطاف و کرم تھا کہ سدا رہتے تھے
اے گل اندام ہمارے گلے کے ہار[۲] ہوئے

۱۷۔ اس میں حیران ہیں کہ کیا ایسی ہوئی ہے تقصیر
قتل کرنے کے تئیں پھرتے ہو[۳] تیار ہوئے

۱۸۔ تیغ خوں ریز بہ کف، خنجر براں بہ میاں
ہر گھڑی سامنے آجاتے ہو خونخوار ہوئے

۱۹۔ ندارد[۵]

۲۰۔ پھر تو کیا[۶] ہے سنتے ہو اٹھو بسم اللہ
کھینچ کر تیغ کو آؤ[۷] جو ستم گار ہوئے

۲۱۔ ورنہ دل کھول کے لگ جاؤ گلے سے پیارے
گو کہ ہم قتل ہی کرنے کے سزاوار ہوئے

۱۴۔ یہ تو ہرگز ہی توقع نہ تھی مجھے ہم کو
کہ ستم کار و جفاکار و دل آزار ہوئے

۱۵۔
شیوۂ جور و جفا سیتی تم اظہار ہوئے

۱۶۔
...... ہمارے تو گلے ہار ہوئے

۱۷۔
....

۱۸۔ ...... خنجر خونیں بہ میاں
...... سامھنے[۴] ......

۱۹۔ گرامی ہیں ہے خوشی دل کی ہمارے تو خیر
ہم بھی راضی ہیں کہ اس جینے سے بے زار ہوئے

۲۰۔ پھر یہ کیا ڈھیل ہے سنتے ہو تو بسم اللہ
....

۲۱۔

[۱] نسخۂ محوی میں "ستم کارہ و جفاکارہ و دل آزار" ہے (معارف) [۲] نسخۂ محوی میں "ہمارے گلے گلہار ہوئے" ہے (معارف)
[۳] نسخۂ محوی: "پھرتے کو جو تیار" ہے (معارف) [۴] مطبوعہ نسخوں میں "سامنے" ہے [۵] نسخۂ محوی میں شعر موجود ہے (معارف)
[۶] "پھر تو کیا ڈھیل ہے" (نسخۂ محوی معارف) [۷] تیغ کو مارو (نسخۂ محوی معارف)

۲۲۔ اتنی[۱] ہی بات کے کہنے میں کہ اک بوسہ دے[۲]
آہ اے شوخ[۳] جو ایسے ہی گنہ گار ہوئے

۲۳۔ توبہ کرتے ہیں قسم کھاتے ہیں سنتے ہو تم
پھر نہیں کہنے[۴] کے آگے کو خبردار ہوئے

۲۴۔ پوچھا کیا ہے تو بیدار ہمارا احوال
دام خوباں میں پھر اب کے گرفتار ہوئے

۲۲۔ .... بات کو کہتے ہیں کہ اک بوسہ دے
آہ صد آہ! جو ایسے ....

۲۳۔ ....
پھر نہیں کہنے کو ....

ندارد

سطور بالا میں مندرج اشعار غزل مسلسل کے طور پر اگرچہ دیوان بیدار مرتبہ جلیل احمد قدوائی میں تعینت [?] بیدار کی حیثیت سے موجود ہیں لیکن یہ تمام اشعار بجز مقطع کلام سودا کے بعض قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں بھی شامل ہیں۔ ذیل میں اس اشتباہ اور التباس کی تفصیلات اور توضیحات سپرد قلم کی جاتی ہیں۔
اس غزل کے ابتدائی پانچ شعر کلام سودا کے تین قلمی[۶] نسخوں میں اور شعر نمبر ۱، ۲، ۴، ۵ صرف ایک[۷] نسخے میں درج ہیں۔ ندوۃ العلماء کے کتب خانے میں مخطوطہ کلام سودا کے ایک قلمی[۸] نسخے میں بھی ایک شعر کے اضافے کے ساتھ یہ تمام اشعار بجز مقطع کے موجود ہیں۔ ڈاکٹر ہاجرہ نے اسی نسخۂ ندوہ اور مذکورہ بالا نسخوں میں سے صرف[۹] دو کی بنیاد پر ان اشعار کو اپنے مرتبہ "دیوان غزلیات مرزا محمد رفیع

[۱] اتنی ہی (نسخۂ محوی معارف) [۲] نسخۂ محوی میں "دیو" ہے (معارف) [۳] اے شوخ ہم ایسے (نسخۂ محوی معارف) [۴] نہیں کرنے (نسخۂ محوی معارف) [۵] نسخۂ محوی میں "ملکوں" ہے (معارف)
[۶] (i) نسخۂ خدا بخش نمبر ۲۲۷ مکتوبہ ۱۱۹۳ھ (ii) نسخۂ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد نمبر ۵۵۶ سنہ کتابت ندارد۔ (iii) نسخۂ لکھنؤ یونیورسٹی مکتوبہ ۱۲۴۹ھ بحوالہ مقدمہ غزلیات مرزا رفیع سودا مرتبہ ڈاکٹر ہاجرہ دلی [?]
[۷] نسخۂ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر ۴۷/۲ سنہ کتابت ۱۲۳۱ھ [۸] نسخۂ ندوہ نمبر ۱۰۶/۱ سنہ کتابت غیر درج [۹] (i) نسخۂ لکھنؤ (ii) نسخۂ خدا بخش۔

سودا" میں شامل کیا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے لندن کے چند[1] قلمی نسخوں کے حوالے سے انہیں اپنے مرتبہ "کلیات سودا" جلد دوم کے حصہ ۲ میں "در شکوہ معشوق" کے عنوان سے قصیدے کی شکل میں پیش کیا ہے۔ ان کی اطلاع کے مطابق یہ تمام اشعار بجز مقطع صرف ایک[2] نسخے میں ملتے ہیں جب کہ دو نسخوں[3] میں ابتدائی چار شعر موجود نہیں اور ایک نسخے[4] میں ابتدائی پانچ شعر غزل کے طور پر درج ہیں۔ پانچواں شعر مقطع کی شکل میں اس طرح منقول ہے۔

"نقد جان و دل و دیں دے کے لیا سودا نے ∴ سیکڑوں اہل ہوس گرچہ خریدار ہوئے"

علاوہ بریں اس غزل کا مطلع ایک معاصر تذکرے "گلشن سخن" از مبتلا لکھنوی سال تصنیف ۱۱۹۴ھ میں سودا کے نام سے اور دوسرے معاصر تذکرے "گل عجائب" از تمنا اورنگ آبادی سال تصنیف ۱۱۹۲۔۹۴ھ میں بیدار کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا دو معاصر تذکروں کے متضاد بیانات اور بیدار کے علاوہ سودا کے بعض مستند دواوین میں زیر بحث غزل کے کلی یا جزوی اندراج نے اس کے انتساب کے تعین کو غیر قطعی بنا دیا ہے۔ تاہم انہیں بیانات کی روشنی میں چند قیاسی توجیہات پیش کی جا سکتی ہیں۔

۱۔ سودا اور بیدار دونوں کے یہاں اس غزل کے بعض اشعار کا متن مختلف ہے۔ ان اختلافات میں سے اکثر مقامات پر دیوان سودا کا متن زیادہ چست اور بامعنی ہے جس پر تصحیح یا ترمیم کا گمان گزرتا ہے۔ حالانکہ بظاہر بیدار کا سودا سے اصلاح لینا کسی بھی ذریعے سے ثابت نہیں لیکن ان کے استاذہ مرتضیٰ قلی بیگ فراق اور خواجہ میر درد کے ساتھ سودا کے دوستانہ تعلقات کے پیش نظر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ بالواسطہ ہی سہی بیدار کی یہ غزل اصلاح سودا کی مرہون منت رہی ہو۔

---

[1] (i) نسخہ برٹش میوزیم مکتوبہ ۱۲۱۲ھ نمبر ۲۶۵۲۶ ڈی (ii) نسخہ انڈیا آفس نمبر ۱۵۰ پی ۲۱۱۹ (iii) نسخہ انڈیا آفس نمبر پی ۹۴۹ پی ۲۷۲۶ (iv) نسخہ انڈیا آفس نمبر پی ۱۵۱ ایو ۶۴ [2] برٹش میوزیم نمبر اے ڈی ڈی ۲۶۵۲۶ [3] (i) نسخہ انڈیا آفس نمبر پی ۱۵۰ پی ۲۱۱۹ (ii) نسخہ انڈیا آفس پی ۹۴ اپی ۲۶۲۶ [4] نسخہ انڈیا آفس نمبر ۱۵۱ ایو ۶۴۔

۲۔ اس غزل کے ابتدائی پانچ شعر کلام سودا کے چند[1] ایسے نسخوں میں بھی پائے جاتے ہیں جن میں الحاقی کلام سرے سے مفقود ہے یا کم ہے۔ کلام سودا کے ایک نسخے[2] میں پانچواں شعر مقطع کے طور پر درج ہے لہٰذا ان اشعار کو سودا کی تصنیف خیال کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ سودا نے پانچ شعر کی غزل کہی تھی تو اس امر کا بہر حال امکان ہے کہ بیدار نے اسی زمین میں اٹھارہ اشعار کہہ کر تضمین کے طور پر سودا کے پانچوں شعر اپنے اشعار میں شامل کر لیے ہوں۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بیدار نے جہاں درد کی دو غزلوں پر بہ صورت مخمس تضمین کی ہیں وہیں سودا کی بھی دو غزلیں تضمین کے طور پر اپنے مخمس میں استعمال کی ہیں۔

۴۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سودا نے پانچ شعر کی غزل کہی ہو اور اسی زمین میں بیدار نے قطعہ کہا ہو پھر غلطی کا شکار ہو کر پورے کلام کو سودا کے کاتبوں نے "دیوان سودا" کا اور بیدار کے کاتبوں نے "دیوان بیدار" کا حصہ قرار دے دیا ہو۔

---

[1] نسخہ خدا بخش اور نسخہ ندوہ وغیرہ۔ [2] نسخہ انڈیا آفس نمبر پی ۱۵۱ ایو ۶۴۔

اخبار علمیہ

اندلس کی جنت سے نکلے ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں، لیکن اس کی یاد اور اس کے ذکر سے مسلمان اہل قلم غافل نہیں رہے ہیں، حال ہی میں ایک عرب اہل قلم ڈاکٹر عصام ناجی نے اندلس کے جزائر بلیار یعنی منورقہ، میورقہ، یابسہ، فرمنتیرہ، قبریرہ وغیرہ کی تاریخ مرتب کی ہے، بحر متوسط کے مغربی کنارے پر واقع ان جزیروں کو بکھرے ہوئے سبز زمردوں سے تشبیہ دی جاتی ہے، زوال اندلس کے وقت یہاں کے مسلمانوں نے مسیحی حملہ آوروں کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا تھا، ۶۸۰ صفحات کی اس کتاب کے پہلے حصہ میں ان جزائر کے عہد اسلامی کی سیاسی تاریخ ہے، دوسرے حصہ میں اسلامی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے آثار و نقوش کا بیان ہے، ناموروں میں حدیث و فقہ و کلام کے عالم اور نابغۂ وقت سعید بن حکم کا تذکرہ ہے، ابن حزم کے معاصر اور ان ہی کے ہم پایہ ابو الولید بن الباریہ میورقی کا بھی ذکر ہے، محمد بن الحسن میورقی، عبد الملک بن ابراہیم میورقی اور ابراہیم بن الحاج احمد الانصاری اپنے زمانہ کے مشہور قاریوں میں تھے. آخر الذکر دونوں حضرات صلیبی حملوں میں شہید ہوئے مشہور عربی شاعر احمد بن عبد اللہ بن عمیر کا تعلق بھی میورقہ سے تھا، کتاب میں پانچ ضمیمے بھی ہیں جن میں فرامین، عہد اسلامی کے سکے اور نقشوں کا بیان ہے، ایک ضمیمہ میں وہاں کے آثار اسلامی کی تصویریں ہیں جن کے رنگ و روغن اور آب و تاب میں آج بھی مردانِ حق عربی شہسواروں کے جگر کا لہو جھلکتا ہے۔

مسلمانوں کے لہو کی امین، سرزمین اسپین (اندلس) کے متعلق گزشتہ دنوں یہ پرمسرت خبر آئی ہے کہ وہاں رومن کیتھولک، پروٹسٹنٹ اور یہودیت کی طرح اسلام کو بھی ایک بڑے

مذہب کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا ہے اور اب اسلامی مدارس اور عبادت گاہوں پر کوئی ٹیکس عائد نہ ہوگا، اس طرح مسجد قرطبہ میں مسلمانوں نے ایک مدت کے بعد نماز ادا کی۔ اسپین میں مسلمانوں کی تعداد دو لاکھ کے قریب ہے، ان کی مختلف دینی و سماجی تنظیمیں سرگرم عمل ہیں، راجدھانی میڈرڈ میں یورپ کا سب سے بڑا اسلامی مرکز زیر تعمیر ہے جس کے لیے اسپین کی حکومت نے مفت زمین فراہم کی اور ۱۲ ملین ڈالر کی خطیر رقم خادم الحرمین شاہ فہد نے عنایت کی ہے؎

رنگ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

خلافت عثمانیہ کے آخری دور سے ترکی کو 'یورپ کا مرد بیمار' کہا جانے لگا، یہ تعبیر عام ہوتی رہی، اب جامعہ ازہر کے ایک اسکالر مجدی الصافوری نے ایک مقالہ میں ثابت کیا ہے کہ یہ تعبیر یہودی پروپیگنڈا کی دین ہے، انہوں نے لکھا کہ تاریخ کی اکثر کتابوں میں اس موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا بلکہ قصداً یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ عہد محض ناکامیوں کا دور تھا، افسوس ناک بات یہ ہے کہ زیادہ تر مورخوں نے اس سلسلہ میں مستشرقین کی کتابوں پر اعتماد کیا ہے جنہوں نے خلافت عثمانیہ کے متعلق بے شمار فسانے گھڑے۔

اندلس، ترکی اور بنگلہ دیش میں مشرق و مغرب کا طویل فاصلہ ہے اس کے باوجود تینوں ایک ہی داستان کے کردار نظر آتے ہیں. بنگلہ دیش کی علمی سرگرمیوں کی خبریں کم ملتی ہیں، اب یہ پڑھ کر حیرت اور مسرت ہوئی کہ وہاں علمی بے تعصبی کی فضا بن رہی ہے، حال ہی میں وہاں قائد اعظم محمد علی جناح اور علامہ اقبال کے متعلق تین کتابیں، دو بنگلہ زبان اور ایک انگریزی میں شائع ہوئی ہے، علامہ اقبال کے متعلق بنگلہ دیش کے اصحاب فکر و نظر کے اقوال و آراء کو پروفیسر سید سجاد حسین نے مرتب کیا ہے، ان کتابوں کی پذیرائی اور قبولیت جس شان سے ہوئی ہے وہ بنگلہ دیش کے مخصوص سیاسی حالات کے پس منظر میں یقیناً حیرت انگیز ہے۔

امریکہ میں مسلمانوں کی ایک بڑی تنظیم (IIT) کا ذکر معارف کے گزشتہ شماروں میں آچکا ہے،

مختلف اسلامی موضوعات پر یہ تنظیم علمی مجلسوں کا اہتمام کرتی رہتی ہے۔ گزشتہ جون میں "سنت بحیثیت ایک از مصادر علوم اسلامی" کے عنوان سے عمان میں ایک سمینار اس کے زیر اہتمام ہوا۔ ماہ رواں میں الجیریا میں منہاجیات (METHODOLOGY) اور سماجی علوم کے زیر عنوان مجلس مذاکرہ ہو رہی ہے۔ تنظیم THE AMERICAN JOURNAL OF ISLAMIC SOCIAL SCIENCES کے نام سے سال میں دو بار ایک علمی رسالہ بھی شائع کرتی ہے، مگر سب سے اہم خبر یہ ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ کی تفسیری روایات کا ایک مجموعہ "مرویات امام احمد بن حنبل فی التفسیر" کے نام سے عنقریب شائع ہونے جا رہا ہے۔ تنظیم کے ڈائریکٹر جنرل ڈاکٹر عبدالحمید ابو سلیمان کو کوالالمپور کی انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی کا نیا ریکٹر بھی مقرر کیا گیا ہے۔

یورپ اور امریکہ کے مسلمان جس طرح اسلام کے لیے متحرک اور سرگرم عمل ہیں، وہ قابل رشک ہے۔ ابھی برطانیہ کے مشہور روزنامہ ڈیلی میل کے کئی نمائندوں نے برطانوی مسلمانوں کے حالات کا ایک مفصل جائزہ لیا جو کئی قسطوں میں چھپا۔ خلاصہ یہ پیش کیا گیا کہ "برطانوی مسلمان اپنے فرائض محنت اور ذمہ داری سے انجام دیتے ہیں، روزانہ چودہ گھنٹے سرگرم عمل رہتے ہیں، اہل و عیال اور احباب و رفقاء کے حق میں مخلص ہیں، اپنی روایات پر قائم ہیں، شریعت پر ان کا عقیدہ مستحکم ہے اور برطانوی معاشرہ کا فساد و انتشار ان میں سرایت نہیں کر سکا ہے۔ بحیثیت مجموعی وہ برطانوی معاشرہ کا سب سے بہتر حصہ ہیں۔" ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ شرائط کی موجودگی میں کنتم خیر امۃ کا دعویٰ اور مژدہ آج بھی برحق ہے۔

"کلام الملوک ملوک الکلام" کوئی ناگریز کلیہ نہیں ہے تاہم اوقاف اور امور اسلامیہ کے وزراء کی چوتھی کانفرنس کے موقع پر شاہ فہد بن عبدالعزیز کی تقریر، دردمندی، متانت اور بصیرت کی وجہ سے ملوک الکلام کہے جانے کی مستحق ہے، انہوں نے عقیدہ، تقویٰ، امت کی اجتماعیت اور اجتہاد کی بات کی اور خاص طور سے تعصب سے دور رہنے کی یہ کہکر تلقین کی کہ اسلام میں نرمی، رواداری، لطف اور توجیہہ بنیادی عناصر ہیں جو ایک مسلمان کے لیے اس کے عقیدہ کو اگر محبوب بناتے ہیں تو غیر مسلم کے لئے اس عقیدہ میں کشش پیدا کرتے ہیں۔ (ع. ص)

وفیات

چند عرب فضلا کی موت

از:۔ حافظ محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی رفیق دار المصنفین

دمشق کے مجلہ مجمع اللغۃ العربیہ کے سال گزشتہ کے شمارے ہم کو حال ہی میں ملے تو ان سے معلوم ہوا کہ علوم اسلامی کے کئی عرب محقق و ادیب گزشتہ دنوں مسند علم سونی کر گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان مرحومین میں استاذ محمد احمد دہمان، ڈاکٹر احمد عبدالسلام الجواری اور ڈاکٹر صبحی المحمصانی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

استاذ محمد احمد دہمان استاذ محمد احمد دہمان کا شمار دمشق کے ان علماء میں ہوتا ہے جنہوں نے عربی زبان و ادب کی نشاۃ ثانیہ کے لیے اپنے کو وقف کر دیا تھا، وہ ۱۸۹۹ء میں دمشق میں پیدا ہوئے، ان کے والد شیخ احمد دہمان بھی ایک مشہور قاری و عالم تھے، محمد احمد دہمان کی تعلیم و تربیت دمشق میں ہوئی، ان کے اساتذہ میں شیخ ابو الخیر میدانی متوفی ۱۹۶۱ء اور شیخ محمد قطب متوفی ۱۹۲۷ء بھی ذی علم اور صاحب فضل و کمال تھے لیکن وہ سب سے زیادہ متاثر شیخ عبدالقادر بدران کی شخصیت سے ہوئے جو ایک وسیع النظر عالم اور مصلح قوم تھے، انہوں نے ابن عساکر کی شہرۂ آفاق تاریخ دمشق کی ترتیب و تدوین کے علاوہ منادمۃ الاطلال و مسامرۃ الخیال کے نام سے ایک اہم کتاب بھی تالیف کی تھی، شیخ محمد قطب مظلوم طبقہ کے حامی تھے اور ان کے لئے عدل و انصاف کی آواز بھی بلند کرتے تھے جس کی وجہ سے انہیں مصائب و آلام سے دوچار ہونا پڑا۔ علم و عمل کی اس جامع شخصیت نے استاذ دہمان کو بہت متاثر کیا۔ چنانچہ ان کے عہد شباب میں جب مدارس کے مقاطعہ اور تعلیم کو ترک کرنے کی ایک تحریک چلی

تو انہوں نے اس کی سخت مزاحمت کرنے کے لئے ایک رسالہ "المصباح" جاری کیا، بعد میں ان کے بلند پایہ مضامین مجلہ التمدن الاسلامی اور مجلہ مجمع العلمی العربی میں برابر چھپتے رہے، انہوں نے مدرسہ عادلیہ میں اسلامی علوم کا شعبہ قائم کیا، جہاں دوسرے اہلِ فکر و نظر کے علاوہ وہ خود بھی عربی ادب اور اسلامی تہذیب و تمدن کے موضوع پر مقالے پیش کرتے رہے، مقصد یہ تھا کہ نوجوان نسل فرانسیسی اور یورپی علم و تہذیب سے مرعوب نہ ہونے پائے۔ علوم اسلامی خصوصاً تاریخ پر گہری نظر تھی، تاریخ میں بھی ان کو دمشق کی تاریخ سے خاص شیفتگی تھی، اور اس سے متعلق کئی قدیم کتابوں کو انہوں نے سلیقہ اور محنت سے مرتب کیا اربلی کی مدارس دمشق، ابن کنان کی المروج السندسیہ، ابن طولون کی القلائد الجوہریہ فی تاریخ الصالحیہ، اعلام الوری اور رحلۃ الامیر یشبک الدوادار وغیرہ ان کی مورخانہ دیدہ وری اور محققانہ ژرف نگاہی کا ثبوت ہیں، جامع اموی پر انہوں نے خود بھی ایک کتاب لکھی، عہد ممالیک کی تاریخ کا انہوں نے بڑی دقت نظر سے مطالعہ کیا تھا، اس موضوع پر ان کی تالیف ولاۃ دمشق فی عہد الممالیک قابل ذکر ہے، ان کی ایک اور کتاب فی رحاب دمشق میں دمشق کے علمی اور تمدنی جلوے دکھائے گئے ہیں، وہاں کے آثار قدیمہ، مساجد و معابد، مدارس و کتب خانوں اور اس کے تاریخی پہاڑ جبل قاسیون کے متعلق جو کتابیں لکھی ہیں ان میں موضوع کی خشکی کو رنگینی و دلفریبی میں تبدیل کر دیا ہے، ان کو دمشق سے اپنی والہانہ محبت کا احساس تھا چنانچہ لکھتے ہیں: "کانت دمشق وما زالت کل دنیای" (پہلے اور آج بھی میرے لیے تو دمشق کل جہان ہے) دمشقیات کے علاوہ انہوں نے ابن جزری کی کتاب النشر فی القراءات العشر، ابن قدامہ مقدسی کی مختصر منہاج القاصدین، محمد بن وضاح قرطبی کی کتاب البدع والنہی عنہا، ابو عمرو عثمان بن سعید الدانی کی کتاب المقنع فی مرسوم مصاحف اہل الامصار

اور سنن دارمی کو مرتب کر کے شائع کیا، تاریخ و رجال میں انہوں نے ابن حجر عسقلانی کی کتاب انباء الغمر بانباء العمر کی پہلی جلد کو بڑے اہتمام سے شائع کیا، ان کی ساری کتابیں تحقیق و کاوش اور محنت و دیدہ ریزی کا بہترین نمونہ ہیں، ان کو اپنی قدیم روایات نہایت عزیز تھیں، تحقیق میں وہ عجلت و سہولت پسند نہیں کرتے تھے، انہوں نے العقائد الجوہریہ کی تحقیق و تدقیق میں دس برس صرف کرنے کے بعد یہ نادر تحفہ علمی دنیا کے سامنے پیش کیا، تاریخی الفاظ کی ایک معجم بھی بڑی محنت سے مرتب کی جس میں عہد ممالیک میں رائج الفاظ کے اصول و ماخذ کا جائزہ لسانیات کے جدید طرز و انداز پر لیا ہے۔ رضوان بن محمد ساعاتی کی کتاب علم الساعات والعمل بہا کو ایڈٹ کیا تو اس میں گھڑی کی صنعت اور فن کے متعلق ارشمیدس اور دوسرے علمار کے مقالات بھی شامل کیے اور سو صفحات کا خود ایک مقدمہ بھی لکھا جس میں عرب اور مسلمان ماہرین فن اور کاریگروں کی اختراعات پر سیر حاصل تبصرہ کیا، علمی حلقوں میں ان کی کتابوں کے مقدمے اور حواشی ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

ان کی نجی زندگی بھی قابل تقلید اور مثالی نمونہ تھی، وہ عزم و صبر کا پیکر تھے، نامساعد حالات میں بھی ان کا دل امید و حوصلہ سے معمور رہتا تھا، وہ اکثر بیمار رہتے، ضعف بصر میں مبتلا تھے لیکن ان کی علمی جد و جہد میں یہ چیزیں کبھی رکاوٹ نہ بنیں اور وہ خاموشی اور سرگرمی کے ساتھ علم و ادب کی خدمت انجام دیتے رہے۔ دوشنبہ ۷ مارچ ۱۹۸۸ء کو ان کا انتقال ہوا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ آمین۔

ڈاکٹر احمد عبدالستار الجواری

عربی زبان کے عاشق شیدائی اور اسلامی علوم خصوصاً قرآنیات کے خادم کی حیثیت سے ڈاکٹر احمد عبدالستار الجواری کا نام عرب کے علمی حلقوں میں تعارف

کا محتاج نہیں۔ ۲۲ر جنوری ۱۹۸۹ء کو وہ نماز جمعہ کی تیاری کر رہے تھے کہ اچانک ان کا
پیمانہ عمر لبریز ہوگیا، انتقال کے وقت ان کی عمر ۶۲، ۶۳ سال تھی اور وہ علم کے بام
عروج پر پہنچے ہوئے تھے۔

وہ ۱۹۲۵ء میں بغداد کے قدیم تاریخی محلہ کرخ میں پیدا ہوئے، اس محلہ کے خانوادے
اور گھرانے آج بھی قدیم عربی روایات وخصوصیات کے حامل ہیں، ڈاکٹر احمد نے بھی
ایک شریف ومعزز خاندان میں آنکھیں کھولیں، بی اے تک کی تعلیم بغداد میں حاصل کی اور
طہ الراوی، مہدی البصیر، عبدالوہاب عزام اور زکی مبارک جیسے ممتاز اساتذہ سے استفادہ
کیا، بعد میں قاہرہ سے ایم اے کیا وہاں ان کو طہ حسین، احمد امین، احمد الشائب، مصطفی
السقا اور ابن الخولی جیسے مشاہیر فضلا کی عنایات بھی حاصل رہیں۔ تعلیم کے بعد وہ عراق کی
مختلف اعلیٰ تعلیمی وانتظامی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے رہے، ۱۹۷۹ء تک وہ کئی
محکموں کے وزیر بھی رہے، لیکن یہ انتظامی سرگرمیاں ان کی علمی وتحقیقی راہ میں کبھی حائل نہ
ہوئیں، عالم عرب کے اہم سمیناروں اور باوقار علمی مجلسوں میں برابر شریک ہوتے رہے۔
ان کے مقالوں اور خطبوں میں عموماً اسلامیات اور امت عربی کے مسائل زیر بحث آتے
جو علمی متانت وسنجیدگی کی وجہ سے بڑی توجہ سے سنے جاتے۔ ان علمی خدمات کے
اعتراف میں ۱۹۶۵ء میں ان کو عراق کی المجمع العلمی کا رکن بنایا گیا، بعد میں وہ دمشق اور
قاہرہ کی علمی اکیڈمیوں کے بھی رکن مقرر ہوئے، ۱۹۶۹ء میں عرب کی یونیورسٹیوں اور
کالجوں کے اساتذہ کی انجمن اتحاد معلمین عرب کے صدر منتخب ہوئے۔

ان کے قلم سے کئی عمدہ کتابیں نکلیں، مضامین کے مجموعے چھپے، کئی امہات کتب
کی تحقیق اور مختلف علوم کی مصطلحات کی ترتیب میں وہ بعض دوسرے محققین کے ساتھ

شریک رہے، بقول ڈاکٹر عدنان خطیب ان کی تمام کتابیں مفید، وقیع اور بلند پایہ
ہیں جن سے ان کی دقت نظر، وسعت فکر، ایمان ویقین کی پختگی اور علمی جرأت کا اندازہ
ہوتا ہے، ان کی ایک کتاب "نحو القرآن" خاص طور سے قابل ذکر ہے جس میں انہوں
نے قرآنی آیات اور عبارتوں کی نحوی اور لغوی خوبیوں بلکہ قرآنی اسلوب کے اعجاز پر
ماہرانہ بحث کی ہے۔ وہ علمائے نحو کو یہ حقیقت اپنے پیش نظر رکھنے کی تلقین کرتے ہیں کہ
قرآن مجید کے اصول، ان کے قواعد وکلیات کی کسوٹی سے زیادہ اہم ہیں۔ اس لئے
اصل محور اسی کو بنانا چاہئے۔ اس کتاب میں انہوں نے علم نحو کے گیارہ پیچیدہ مسائل پر
گفتگو کی ہے۔ سب سے عمدہ بحث "حذف القول" کی ہے جس کے نظائر وشواہد قرآن
مجید میں بکثرت ملتے ہیں، انہوں نے الفاظ کی رمزیت، کنایہ کے زور، اجمال وتفصیل
اور سیاق کلام کی معنویت وتاثیر کے متعلق بڑی لطیف اور عالمانہ بحث کی، امام زمخشری
کے اس قول کہ "ان ھٰؤلاء محکی بعد قول مضمر" کی تشریح میں لکھا کہ "اس خوبصورت
اسلوب میں تعبیر کے کئی دلکش فنی مظاہر ہیں، جس میں حذف نحوی، ایجاز، فصل، وغیرہ
شامل ہیں۔" عام نحوی اصولوں پر بھی ان کی محققانہ بحث پڑھنے کے لائق ہے۔

ان کا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب ذکر مبین کے لئے جس زبان کو شرف
انتخاب بخشا اس کی حفاظت ایک دینی فریضہ ہے اور اس کی حمایت کے لئے سینہ سپر
ہونا، راہ شہادت پالینے کے مترادف ہے، اللہ تعالیٰ ان کے جذبۂ ایمانی کے طفیل میں
انہیں عالم آخرت میں اپنی رضا وخوشنودی سے سرفراز فرمائے۔

ڈاکٹر صبحی المحمصانی

ڈاکٹر صبحی المحمصانی عالم عرب میں شریعت اسلامی اور اس کے جدید
ملکی وبین الاقوامی قوانین کے مرجع اور سند سمجھے جاتے تھے، انگریزی اور فرانسیسی

زبانوں پر ان کو یکساں عبور رہا، ان کا انتقال پیرس میں ستمبر ۱۹۸۶ء میں ہوا لیکن مجمع اللغۃ العربیہ اکتوبر ۸۸ء کے شمارہ میں ان کی شخصیت پر تعزیتی مضمون تاخیر سے شائع ہوا، ان کی قابل قدر علمی زندگی خصوصاً قانون کے موضوع پر ان کے اہم اور یادگار کارناموں کی وجہ سے ان کی وفات کا غم آج بھی تازہ ہے۔

وہ ۱۹۰۶ء میں بیروت میں پیدا ہوئے، اعلیٰ تعلیم کے لئے فرانس گئے، ۳۲ء میں ڈاکٹریٹ کیا، ۳۵ء میں لندن یونیورسٹی سے بھی ڈگری لی، دوران تعلیم ان کے خاص مضامین قانون اور معاشیات تھے، تعلیم کے بعد وہ لبنان میں اعلیٰ قانونی عہدوں پر فائز ہوئے، ۶۶ء میں وہ لبنان کے وزیر اقتصادیات بھی ہوئے، لیکن سیاسی زندگی کی شورشیں اور بکھیڑے ان کے مزاج کے مطابق نہیں تھے اس لیے اس سے کنارہ کش ہو کر علمی اور تدریسی سرگرمیوں میں مشغول ہوئے اور پھر تصنیف و تالیف کے لیے یکسو ہو گئے، وہ ۴۷ء میں دمشق کی مجمع العلمی کے رکن بنے، مسلم ممالک میں اسلامی قانون کے نفاذ کے سلسلہ میں انہوں نے کئی اہم کانفرنسوں میں خصوصی مدعو کی حیثیت سے شرکت کی۔ ان کی تصنیفات کا زیادہ حصہ اسلامی قانون سے متعلق ہے، ان کی ایک کتاب فلسفۃ التشریع فی الاسلام بہت مقبول ہوئی، انگریزی اور فارسی میں اس کے ترجمے ہوئے، اردو میں بھی اس کا ترجمہ لاہور سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ النظریات العامہ للموجبات والعقود فی الشریعۃ الاسلامیۃ، الاوضاع التشریعیہ فی الدول العربیہ، المبادی الشرعیہ والقانونیہ، مقدمہ فی احیاء علوم التراث، القانون والعلاقات الدولیہ فی الاسلام، الدعائم الخلقیہ للقوانین الشرعیہ، ارکان حقوق الانسان فی الشریعۃ الاسلامیہ، الاوزاعی وتعالیمہ القانونیہ والانسانیۃ، المجتہدون فی القضاء،

تراث الخلفاء الراشدین فی الفقہ وغیرہ کتابوں کی اہمیت ان کے نام سے ہی ظاہر ہے۔ اول الذکر کتاب کو نقادوں نے اپنے موضوع پر بہترین کتاب قرار دیا ہے، اس میں مستند فقہی مصادر سے اخذ و استدلال کے بعد یورپ کے قانونی ماخذ سے ان کا موازنہ خالص علمی انداز میں کیا گیا اور پھر فقہ اسلامی کی برتری ثابت کی گئی ہے، امام ابو یوسف اور علامہ ابن قیم کے فقہی اور اجتہادی کارناموں پر بھی انہوں نے کتابیں لکھیں، التشریع اللبنانی میں انہوں نے لبنان کے مختلف مذاہب اور فرقوں کے لئے یکساں سول کوڈ کی وکالت کی اور اس کے لیے شریعت اسلامی کے قوانین کو جامع ثابت کیا، ان کی ایک کتاب المجاہدون فی الحق تذکارات من مالک الی السنہوری میں امام مالک سے لے کر ڈاکٹر عبدالرزاق سنہوری تک کے نامور فقہاء اور قانون دانوں کا تذکرہ ہے، کتاب کا خاتمہ انہوں نے علامہ اقبال کے ذکر پر کیا، وہ علامہ اقبال کے فلسفہ احترام آدمیت اور ان کے عالمگیر اسلامی جذبہ اخوت کے بڑے معترف تھے، انہوں نے کلام اقبال کے دور رس اثرات کا بڑی خوبی سے تجزیہ کیا ہے۔

اپنے وطن لبنان کے خون آشام واقعات سے وہ ملول تھے، ان کا کہنا تھا کہ اجتماعی و معاشرتی سکون صرف روحانی انقلاب سے مل سکتا ہے اور یہ روحانی انقلاب ہمارے عظیم دینی و اخلاقی ورثہ سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو شرفِ قبولیت بخشیں اور جنت نعیم میں جگہ عطا فرمائیں۔

ادبیات

ملتِ بیضا

(ماضی۔ حال۔ مستقبل)

از:۔ جناب مقصود احمد مقصود لکچرار ایم۔ ایس۔ یونیورسٹی بڑودہ

(۱)

ہمیں نے دلوں کو خدا آگہی دی / ہمیں نے تو روحوں کو پاکیزگی دی

ہمیں نے کیا ختم آقائیت کو / غلاموں کو آزادئ ہمسری دی

گلا گھونٹ کر آمریت کا ہم نے / فسردہ دلوں کو نئی زندگی دی

زمانے کو انصاف و قانون دے کر / مساوات کی رسم کو برتری دی

فساد اور جنگ و جدل کے جہاں کو / ہمیں نے پیام محبت دیا، آشتی دی

ہمیں نے سکھایا چلن زندگی کا / سلیقہ ہمیں نے دیا بندگی کا

(۲)

وہ ناموسِ مریم، وہ حوا کی عزت / سمجھتے تھے جس کو مجسم نحوست

جسے اپنی ہی جاں بہ لب ہوگئی پر / نہ تھی جیتے جی اک ہنسی کی اجازت

زمیں میں جسے دفن کرتے تھے زندہ / بخوفِ فلاکت بعارِ ندامت

کسی نے فقط اس کو سمجھا کھلونا / کسی نے فقط منبعِ عیش و عشرت

جسے کچھ بھی حاصل نہ تھا زندگی میں / نہ عفت، نہ عزت، نہ ارث و وراثت

لباسِ شرف اس کے ہاتھوں میں دیکر / ہمیں نے اسے جزو ایماں بتایا

(۳)

جو سینے میں تھا سیلِ جذبات محصور / امڈنے پہ ہم نے کیا اس کو مجبور

جو دریا نالوں کے ٹھہرے ہوئے تھے / انہیں ہم نے بخشا روانی کا دستور

ہمیں نے گلستاں کی ہر اک کلی کو / تر و تازگی کا دیا رنگ اور نور

قلم کر کے دستِ خزاں کو ہمیں نے / چمن کو بہاروں سے رکھا تھا معمور

(۴)

روش ہم نے بدلی مگر رفتہ رفتہ / اسی سے ہوئے بے اثر رفتہ رفتہ

خزاں حملہ آور ہوئی گلستاں پر / بہاروں نے ڈالی سپر رفتہ رفتہ

ہوئی ہر روش پھر تو بے کیف و بے رنگ / ہوئے برگ و گل زرد تر رفتہ رفتہ

(۵)

مسیحاؤ! چارہ گرو! باغبانو! / نہ سوچو کہ اب اپنا انعام کیا ہو

کرو فکر تنظیم کی کوئی ورنہ / "خدا جانے گلشن کا انجام کیا ہو"

غزل

از:۔ بسنت کمار بسنت ایڈوکیٹ۔ رکاب گنج، لکھنؤ

کسی کے غم میں کوئی مبتلا نہیں ملتا / جہاں میں کوئی بھی درد آشنا نہیں ملتا

دلوں میں یادِ بتاں کے سوا نہیں کچھ بھی / گلہ ہے اس پہ کہ ہم کو خدا نہیں ملتا

چمن کے پھولوں کو آخر نظر لگی کس کی / کوئی بھی پھول کہیں بھی کھلا نہیں ملتا

تمہیں ملے گی نہ منزل کبھی بھی ہمسفرو / تمہارے پاؤں میں اک آبلہ نہیں ملتا

میں اپنے شہر کی بے مہری پہ حیراں ہوں / سب اجنبی ہیں کوئی آشنا نہیں ملتا

بھنور میں ڈوب رہا ہے سفینۂ ہستی / بچائے کون کوئی ناخدا نہیں ملتا

بسنت غمکدۂ دہر میں بہت ڈھونڈھا / کسی بھی گام پہ وہ باوفا نہیں ملتا

مطبوعات جدیدہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی | مرتبہ ڈاکٹر رشید الوحیدی، تقطیع کلاں، کاغذ اچھا، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۵۱۲ مجلد قیمت ۷۵ روپے، پتہ الجمعیۃ بکڈپو، جمعیۃ بلڈنگ، گلی قاسم جان، دہلی ۶۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی ذات علم و عمل، شریعت و طریقت کی جامع اور سلف صالحین کی یادگار تھی، ان کے علمی و دینی کمالات اور سیاسی و قومی خدمات کا دائرہ بہت وسیع تھا، درس و تدریس کی طرح ان کے رشد و ہدایت کا فیض بھی برابر جاری رہتا تھا، انہوں نے مسلمانوں کی دینی و سیاسی رہنمائی کے علاوہ ملک و وطن کی آزادی کی تحریک میں بھی سرگرم حصہ لیا تھا۔ اس طرح ان کی ذات علمی و دینی کمالات کا مجموعہ اور ان کی زندگی مجاہدانہ کارناموں سے پُر تھی، مولانا کی ان گوناگوں اور متنوع خدمات کے اعتراف کے لئے جمعیۃ علمائے ہند نے ۱۸، ۱۹ مارچ ۸۸ء کو دفتر جمعیۃ علما مسجد عبد النبی میں ایک سمینار کیا تھا جو ان کے متحرک و فعال خلف الرشید مولانا سید اسعد مدنی اور جمعیۃ کے مخلص کارکنوں کی جد و جہد سے کامیاب رہا، سمینار کے کنوینر ڈاکٹر رشیدی الوحیدی استاذ جامعہ ملیہ کی مساعی جمیلہ سے اب اس میں پڑھے گئے مقالات کا یہ مجموعہ شائع ہوا ہے، لائق مرتب نے اس میں ان مقالوں کو بھی شامل کر دیا ہے جو سمینار کے لئے لکھے گئے تھے، مگر مقالہ نگار حضرات تشریف نہیں لا سکے تھے، سر فہرست مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کا مقالہ ہے جن کے مولانا سے گوناگوں تعلقات بھی تھے اور قریبی واقفیت بھی، دوسرا مقالہ مشہور مورخ و فاضل پروفیسر خلیق احمد نظامی کے قلم سے ہے جو اپنے مشمولات

و رعنائی تحریر اور دلکش انداز بیان کی وجہ سے مطالعہ کے قابل ہے، دوسرے ممتاز اصحاب علم و قلم میں مولانا قاضی زین العابدین، ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری، مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، مولانا نسیم احمد فریدی، مولانا ابو العرفان ندوی، پروفیسر تنویر احمد علوی، ڈاکٹر سید عبد الباری، مولانا شمس تبریز خاں وغیرہ کے مضامین قابل ذکر ہیں، مقالات کے اس مجموعہ سے مولانا کی سیرت و شخصیت، حالات و کمالات اور مجاہدانہ و سرفروشانہ زندگی کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں، اس لحاظ سے یہ مفید اور سبق آموز ہے مگر اس کی ترتیب اور اچھے طور سے کرنے کی ضرورت تھی، جیسے مضامین مختلف عنوانات کے تحت شائع کئے جاتے تو ترتیب بھی خوشنما ہو جاتی اور کتاب سے استفادہ میں بھی آسانی ہوتی، مضامین کو حک و اصلاح اور حشو و زوائد اور تکررات کو حذف کرنے کے بعد شائع کرنا چاہئے تھا، محض تبرک کے لیے ہر مضمون کی اشاعت ضروری نہیں تھی، کہیں کہیں حواشی بھی تحریر ہوتے تو کتاب کی قدر و قیمت بڑھ جاتی، کتابت کی غلطیاں اور صفحات کی بے ترتیبی بھی ہے، مولانا مدنی پر اس سے پہلے بھی بعض کتابیں چھپ چکی ہیں مگر اب بھی ایک بہتر اور موجودہ مذاق کے مطابق اچھی کتاب کی ضرورت باقی ہے، مولانا اسعد مدنی جیسے فعال شخص کیلئے یہ مشکل نہیں ہے۔

کتاب مجالس المیمنی | مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد، تقطیع کلاں، کاغذ عمدہ، طباعت ٹائپ، صفحات ۹۲ مع دو تصویریں، قیمت تحریر نہیں، پتہ شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

ترقی اردو بورڈ کراچی کی دعوت پر عربی زبان و ادب کے متبحر عالم مولانا عبد العزیز میمنی مرحوم نے عربی زبان کے بعض پہلوؤں پر جو لکچر دیئے تھے وہ ترقی اردو بورڈ کے رسالہ "اردو نامہ" میں ۶۹ء و ۷۰ء کے شماروں میں شائع ہوئے تھے، گو مولانا میمنی کی عمر اس زمانہ میں اسی برس کی تھی، اور انھوں نے فی البدیہہ یہ لکچر دیئے تھے، تاہم یہ تقریریں بڑی پر از معلومات اور بصیرت افروز ہیں، ان میں عربی زبان و ادب کی تاریخ و تدوین، اس کے آغاز و ارتقا، اس میں تحریر و کتابت اور

تصنیف وتالیف کے رواج اور مختلف علوم وفنون کی اہمات کتب اور انکے مؤلفین ومصنفین کے بارے
میں مولانا نے اپنے وسیع علم ومطالعہ کا نچوڑ پیش کیا ہے، انھوں نے عجمیوں کی خدمات کو خاص طور
پر نمایاں کیا ہے، جن کے اعتراف میں عرب مؤلفین عموماً بخل سے کام لیتے ہیں، ان محاضرات سے مولانا
کی وسعت علم ونظر اور عربی زبان وادب پر ان کے عبور کا اندازہ ہوتا ہے مگر اردو میں ہونے کی وجہ
سے ان عالمانہ ومبصرانہ خیالات سے عربی خواں طبقہ کا فائدہ اٹھانا ممکن نہیں تھا اسلیئے مولانا میمنی کے
تلمیذ اجل پروفیسر مختار الدین احمد سابق صدر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی نے ان کا عربی ترجمہ کراکے شائع
کیا ہے، وہ خود علم وفن کے دلدادہ اور تصنیف وتالیف کا اچھا ذوق رکھتے ہیں اس لیے انھوں نے
یہ کتاب بڑی محنت وجانفشانی سے ایڈٹ کی ہے انکے مفید حواشی سے کتاب کی قدر وقیمت دوچند ہوگئی ہے۔

یادگار نمبر بہ تقریب جشن صد سالہ مدرسہ محمدی | تقطیع کلاں، کاغذ عمدہ صفحات ۱۴۸، شائع کردہ:
مدرسہ محمدی باغ دیوان صاحب مدراس ۱۴

جنوبی ہند کے مشہور خانوادہ نوائط میں مولانا محمد غوث شرف الملک (متوفی ۱۲۳۸ھ) بڑے
صاحب علم وکمال شخص گذرے ہیں، جو کرناٹک کے نواب عظیم الدولہ کے دیوان بھی تھے، انکے بعد بھی انکے خاندان
کا علمی شغف وانہماک باقی رہا اور یہ سلسلہ اب بھی قائم ہے، خانوادہ شرف الملک کی ایک شاخ حیدرآباد
میں بھی آباد ہوگئی تھی جس کے گل سرسبد مشہور فاضل ومتبحر عالم ڈاکٹر محمد حمید اللہ ہیں جو اب پیرس میں مقیم
ہیں، مدرسہ محمدی باغ دیوان صاحب مدراس بھی خانوادہ شرف الملک کی مشہور علمی یادگاروں میں ہے۔
اسکا کتب خانہ اپنے نوادر اور عمدہ مخطوطات کی وجہ سے پورے ملک میں بے نظیر ہے، مدرسہ کے
قیام کو سو برس ہوگئے اس لیے گذشتہ سال اسکا صد سالہ جشن منایا گیا تھا، جس میں راقم کو بھی شرکت کی
دعوت دی گئی تھی لیکن افسوس وہ اس سعادت سے محروم رہا، مدرسہ کے جشن کے موقع پر اس کے مخلص کارکنوں
نے یہ یادگار نمبر شائع کیا ہے، اس میں مدرسہ کی گذشتہ تاریخ اور موجودہ حالت نیز کتب خانہ

شرف الملک اور اسکے نوادر سے متعلق اہم مضامین اور تحریریں شائع کی گئی ہیں، مدرسہ کے قدیم اور موجودہ
خدمت گذاروں اور مشہور فضلاء کے نام اور نصاب تعلیم کا بھی ذکر ہے، اس یادگار نمبر سے مدرسہ کی نمایاں
کارگذاری اور اہم خصوصیات وامتیازات کا پتہ بھی چلتا ہے اور خانوادہ شرف الملک کی علمی ودینی
خدمات کا مرقع بھی سامنے آتا ہے، اس کا سب سے سیر حاصل مقالہ خود ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا ہے جو مختلف النوع
معلومات پر مشتمل ہے، دوسرے مضامین سے بھی خانوادہ شرف الملک کے علمی ودینی کارناموں اور مدرسہ
کی شاندار خدمات کا اندازہ ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اسکو قائم ودائم رکھے، آمین۔

کتاب دوستاں | از حکیم محمد سعید صاحب، ترتیب جناب مسعود احمد برکاتی صاحب، تقطیع خورد،
کاغذ کتابت وطباعت عمدہ مجلد مع خوبصورت گردپوش صفحات ۱۳۶ قیمت ۳۰ روپئے، پتہ ہمدرد
فاؤنڈیشن پریس، ہمدرد سنٹر، ناظم آباد کراچی۔

حکیم محمد سعید کے مشاغل اور دلچسپیاں گوناگوں ہیں لیکن ان سب کا مقصد خدمت وراحت رسانی
ہے وہ ایک ماہر وحاذق طبیب اور اچھے مصنف ومشاق اہل قلم ہیں، سن رسیدہ لوگوں کی طرح خورد
سال بچوں کی علمی رہنمائی، ذہنی ودماغی تربیت اور سیرت وکردار کی تشکیل کے لیے بھی انکا قلم وقف رہتا
ہے وہ بچوں کے نبض شناس اور ان کی نفسیات سے پورے طور پر واقف ہیں اور ان کے لیے "ہمدرد
نونہال" کے نام سے ایک مفید اور دلچسپ رسالہ بھی نکالتے ہیں جسمیں بچوں کے مذاق کا خیال رکھتے
ہوئے آسان وسہل زبان اور دلچسپ انداز میں مختصر مگر موثر سبق آموز اور حکیمانہ مضامین اور تحریریں چھپتی
ہیں، حکیم صاحب کو اپنے دین ومذہب سے گہرا شغف اور قوم ووطن سے مخلصانہ محبت ہے نیز انکا دل ملک و
ملت کی خدمت کے جذبہ سے معمور ہے، یہی متاع گراں بہا وہ نونہالوں کے قافلے میں بھی لٹانا چاہتے
ہیں، اس کتاب میں انھوں نے بچوں کو خدمت، محنت، کوشش اور سوچ سمجھکر کام کرنے اور وقت کی
قدر وقیمت پہچاننے کی تاکید کی ہے، صحت وصفائی اور ورزش کرنے، علم حاصل کرنے، حسن سیرت

اور عمدہ اخلاق کے زیور سے آراستہ ہونے کی تلقین کی ہے، اللہ و رسول کی فرماں برداری، قرآن مجید سے رہنمائی حاصل کرنے، بڑوں کا حکم ماننے، سب کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے، کسی کی برائی و بدخواہی سے بچنے اور اپنے ملک کا وفادار بننے وغیرہ پر مختلف پیرائے میں زور دیا ہے، یہ بات بھی بار بار ذہن نشین کرائی ہے کہ آدمی دولت و ثروت اور عہدہ و منصب سے بڑا نہیں ہوتا بلکہ علم، اخلاق، تجربہ اور محنت سے بڑا ہوتا ہے دراصل یہ اصولی اور بنیادی باتیں آج کل بڑے لوگوں میں بھی مفقود ہوگئی ہیں اسلیئے بچوں کی طرح انکو بھی اس سے فیض پہونچے گا، جناب مسعود احمد برکاتی نے زر و جواہر سے بھی زیادہ قیمتی ہمدرد نونہال کے صفحات میں بکھری ہوئی ان تحریروں کو بہت خوبی اور سلیقہ سے جمع کردیا ہے اس سے بچوں کے ادب و لٹریچر میں ایک بہت مفید کتاب کا اضافہ ہوا ہے جسکو پڑھنے میں انھیں لذت بھی ملے گی، اور وہ خواب غفلت سے بیدار بھی ہوں گے۔

اردو نعت کا شرعی محاسبہ | مرتبہ جناب شمس بدایونی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۹۸، قیمت پندرہ روپئے، پتہ: روشن پبلیکیشنز، روشن محل، سوتھا، بدایوں۔

جناب شمس بدایونی بدایوں کے مشہور صحافی ہیں جو ادبی مسائل پر بھی مضامین اور کتابیں لکھتے رہتے ہیں، اس کتاب میں انھوں نے اردو نعتوں کا جائزہ لے کر دکھایا ہے کہ ان میں شرعی حیثیت سے کیا قابل اعتراض اور گمراہ کن مواد شامل ہوگیا ہے جن سے بچنے کی ضرورت ہے مصنف نے اس سلسلہ میں اگیارہ امور اور پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مختار کل ہونا اور قاب قوسین کا تصور وغیرہ، شروع میں انھوں نے نعت گوئی کی مختصر تاریخ اس کی اہمیت اور شرعی حیثیت بھی اچھے انداز میں بتائی ہے اور آخر میں اسکے شرعی موضوعات کا تعین کیا ہے نعت گو شعرا، فرط عقیدت کی بنا پر عموماً بے احتیاطی کر جاتے ہیں اور الوہیت و نبوت کا فرق نہیں کرتے اس لحاظ سے یہ کتاب مفید اور قابل مطالعہ ہے۔ "ض"

تصنیفات مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

1. سیرۃ النبی جلد سوم۔ معجزہ کے امکان و وقوع پر علم کلام اور قرآن مجید کی روشنی میں مفصل بحث۔ قیمت ۵۸/-
2. سیرۃ النبی جلد چہارم۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ فرائض۔ ۵۸/-
3. سیرۃ النبی جلد پنجم۔ فرائض خمسہ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور جہاد پر سیر حاصل بحث۔ ۳۸/-
4. سیرۃ النبی جلد ششم۔ اسلامی تعلیمات، فضائل ورذائل اور اسلامی آداب کی تفصیل۔ ۵۸/-
5. سیرۃ النبی جلد ہفتم۔ معاملات پر مشتمل متفرق مضامین و مباحث کا مجموعہ۔ ۲۳/-
6. رحمت عالمؐ۔ مدرسوں اور اسکولوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کیلئے سیرت پر ایک مختصر اور جامع رسالہ۔ ۷/-
7. خطبات مدراس۔ سیرت پر آٹھ خطبات کا مجموعہ جو مسلمانان مدراس کے سامنے دیے گئے تھے۔ ۱۶/-
8. سیرت عائشہؓ۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حالات و مناقب و فضائل۔ ۲۵/-
9. حیات شبلیؒ۔ مولانا شبلیؒ کی بہت مفصل اور جامع سوانح عمری۔ ۵۸/-
10. ارض القرآن ج ۱۔ قرآن میں جن عرب اقوام و قبائل کا ذکر ہے ان کی عصری اور تاریخی تحقیق۔ ۲۴/-
11. ارض القرآن ج ۲۔ بنو ابراہیم کی تاریخ قبل از اسلام، عربوں کی تجارت اور مذاہب کا بیان۔ ۱۸/-
12. خیام۔ خیام کے سوانح و حالات اور اس کے فلسفیانہ رسائل کا تعارف۔ ۴۵/-
13. عربوں کی جہازرانی۔ بمبئی کے خطبات کا مجموعہ۔ ۱۵/-
14. عرب و ہند کے تعلقات۔ ہندوستانی اکیڈمی کے تاریخی خطبات (طبع دوم عکسی) ۴۹/-
15. نقوش سلیمانی۔ سید صاحبؒ کے منتخب مضامین کا مجموعہ جن کا انتخاب خود موصوف نے کیا تھا (طبع دوم عکسی) ۴۲/-
16. یادرفتگان۔ ہر شعبۂ زندگی کے مشاہیر کے انتقال پر سید صاحبؒ کے تاثرات ۳۳/-
17. مقالات سلیمان (۱) ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین کا مجموعہ۔ ۳۳/-
18. مقالات سلیمان (۲) تحقیقی اور علمی مضامین کا مجموعہ۔ ۲۹/-
19. مقالات سلیمان (۳) مذہبی و قرآنی مضامین کا مجموعہ (بقیہ جلدیں زیر ترتیب ہیں) ۲۹/-
20. برید فرنگ۔ سید صاحبؒ کے یورپ کے خطوط کا مجموعہ۔ ۲۰/-
21. دروس الادب حصہ اول و دوم۔ جو عربی کے ابتدائی طالب علموں کے لیے مرتب کیے گئے ۴/- ۶/-

"منیجر"